Regd.L.NO 7243

Phone 880800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اس پرچہ میں

۱۔ مفکرِ قرآن کے ایک ذاتی معالج کے تاثرات

۲۔ خونِ دل کے چراغ

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵۔بی۔گلبرگ۔لاہور

قیمت فی پرچہ 4روپے

قرآنی نظامِ ربوبیّت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماھنامہ ـــــ لاھور

قیمت فی پرچہ	ٹیلیفون :- ۸۸۰۸۰۰	بدل اشتراک
۴	خط وکتابت	سالانہ
چار روپے	ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور	پاکستان /۴۸ روپے غیر ممالک ۹۸ روپے
شمارہ ۵-۶	جون ۱۹۸۵ء	جلد ۳۸

فہرست

۱۔ لمعات ـــ ۲
۲۔ انسانی اعضاء کی پیوند کاری ـــ (رابطہ العالم الاسلامی کا فتویٰ) ـــ ۶
۳۔ ذکرِ پرویز ـــ (سید اقبال ظفر علی علوی) ـــ ۹
۴۔ تبصرہ کتب ـــ ۱۵
۵۔ روزوں کے احکام ـــ ۱۷
۶۔ داغوں کی بہار ـــ (مسلسل) ـــ ۲۱
۷۔ مطالب الفرقان، جلد ششم کا پہلا ایڈیشن ـــ ۲۴
۸۔ مفکرِ قرآن کے ایک ذاتی معالج کے تاثرات (ڈاکٹر صلاح الدین اکبر) ـــ ۲۵
۹۔ نالۂ غم ـــ (عارف بٹالوی صاحب) ـــ ۴۰
۱۰۔ افکارِ پرویز کی صدی ـــ (محمد اسلام صاحب) ـــ ۴۱
۱۱۔ خونِ دل کے چراغ ـــ (ثریا عندلیب صاحبہ) ـــ ۶۱

ایڈیٹر: محمد خلیل، ناشر: شیخ عبدالحمید۔ مقام اشاعت ۲۵-بی گلبرگ نمبر ۲ لاہور۔ مطبوعہ اشرف پرنٹنگ پریس ۹ ایبک روڈ لاہور

لمعات

ملکِ عزیز، ایک دفعہ پھر، جمہوریت کی راہ پر گامزن ہو چکا ہے۔ ہمارے نئے وزیراعظم محترم جناب محمد خاں جونیجو صاحب نے اپنے عہدے کا حلف اٹھانے کے بعد، جو پہلی نشری تقریر فرمائی، اس میں آپ نے ملک سے رشوت کی لعنت ختم کرنے کے اپنے عزم کا اعلان کیا۔ ان کے اس اعلان کا، ملک کے ہر طبقۂ فکر نے خیر مقدم کیا ہے۔ طلوعِ اسلام کی تو گویا ہر دل کی آواز تھی۔ اس کے صفحات شاہد ہیں، کہ اس نے اس لعنت کو جو قوم کا خون اکاس بیل کی طرح چوس رہی ہے، کو ختم کرنے کے لئے کئی بار آواز بلند کی ہے۔

ہمارے نئے وزیراعظم، خاموش طبع انسان دکھائی دیتے ہیں۔ وہ باتیں بہت کم کرتے ہیں اور یہ عام مشاہدے کی بات ہے کہ جو قومی لیڈر کم باتیں کرتا ہے، وہ عملی کاموں کی طرف زیادہ توجہ دیتا ہے۔ اس لئے امید ہے کہ انہوں نے رشوت ختم کرنے کے جس عزم کا اظہار فرمایا ہے، اسے وہ ضرور عملی جامہ پہنائیں گے۔

قیامِ پاکستان کے بعد، متعدد حکومتیں برسرِ اقتدار آچکی ہیں، ان سب نے اس برائی کو ختم کرنے کی کوشش کی، اسے ایک سنگین قومی جرم قرار دیا گیا۔ لیکن عام طور پر اس کی زد میں نچلا طبقہ ہی آتا رہا۔ بڑے لوگ، جو اس خرابی کے اصل ذمہ دار تھے، صاف بچ جاتے رہے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک قدم یہ بھی اٹھایا گیا کہ جن مقامات پر رشوت کا زیادہ امکان تھا، وہاں نمایاں جگہ پر یہ حدیثِ مبارک لکھ کر آویزاں کر دی گئی۔

الراشی والمرتشی کلا ھما فی النار

ترجمہ: رشوت لینے اور دینے والا، دونوں جہنم کی آگ میں ڈالے جائیں گے۔

لیکن ہم اسلامی تعلیمات سے، اتنے دُور جا چکے ہیں کہ کوئی بھی اس ارشادِ نبوی کا نوٹس نہیں لیتا۔ بلکہ اس کے برعکس، دن بدن رشوت کی شرح میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔

لیکن گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں۔ اگر ہم اسلامی تعلیمات پر صدقِ دل سے عمل شروع کر دیں، تو اس لعنت سے چھٹکارا حاصل کیا جا سکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے، چند عملی اقدامات کے ذریعے ہی اس برائی کو ختم کیا تھا۔ اب بھی ان عملی اقدامات کو اپنا کر مطلوبہ نتائج حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد، اہلِ وطن کو تجارتی کاروبار کے وسیع مواقع حاصل ہو گئے لیکن ملک

پر سرمایہ داری نظام کی گرفت کی وجہ سے' اس کاروبار کے نتیجے میں جو خوشحالی حاصل ہوئی وہ امراء کے ایک خاص طبقے تک محدود رہی، عامتہ الناس کی اکثریت اس سے محروم رہی۔ بڑے زمین داروں کے طبقے کے ساتھ مل کر ان لوگوں نے اپنی خوشحالی کو عیش وعشرت کی نذر کرنا شروع کیا۔ شادی بیاہ کی شاندار تقریبات، بڑی بڑی کوٹھیاں اور نئے نئے ماڈل کی کاریں، ان کی زندگی کا مطمعِ نظر بن گئیں۔ ان چیزوں کی چمک دمک سے متاثر ہوکر، دوسرے بہت سے لوگ بھی، حصولِ دولت کی دوڑ میں شریک ہوگئے۔ اور ہر کوئی عیش وعشرت کے سامان حاصل کرنے کی تگ ودو میں لگ گیا۔ اس مقصد کے لئے ناجائز ذرائع آمدنی اختیار کرنے سے بھی گریز نہ کیا گیا۔ ان ذرائع میں رشوت سرفہرست تھی۔

ہمارے معاشرے میں پہلے شادی بیاہ کی تقریبات بڑی سادگی سے سرانجام پاتی تھیں۔ لیکن قیامِ پاکستان کے بعد جو خوشحال طبقہ وجود میں آیا، اس نے ان تقریبات پر اتنی زیادہ دولت لٹانی شروع کی کہ عامتہ الناس کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ سرکاری ملازم، جن کا مذکورہ بالا طبقہ سے، کسی نہ کسی حیثیت سے تعلق تھا وہ بھی نمود ونمائش کی اس دوڑ میں شریک ہوگئے۔ ان کے جائز ذرائع آمدنی سے تو ایسا کرنا ممکن نہ تھا، اس لئے انہیں رشوت کا سہارا لینا پڑا۔ نمود ونمائش کی اس دوڑ سے خود حکومت پریشان ہوگئی، اس نے شادی بیاہ کے اخراجات اور جہیز کی مالیت پر پانچ ہزار کی حد لگا دی۔ لیکن شاید ہی کسی شادی میں ان پابندیوں کا خیال کیا جاتا ہو۔ آج معمولی سے معمولی جہیز کی مالیت بھی لاکھوں سے تجاوز کر چکی ہے۔ اس لئے رشوت کو ختم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ شادی بیاہ اور جہیز کے سلسلے میں جو قانون بنایا جا چکا ہے، اسے مزید مؤثر بنا کر اس پر سختی سے عمل کیا جائے۔ شادی والا گھرانہ، کتنا ہی امیر اور بااثر کیوں نہ ہو، اسے مقررہ حد سے ایک پیسہ بھی زیادہ خرچ کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔

جہیز کی مالیت کو پانچ ہزار کی حد تک محدود کرنے والے قانون میں سونے کے زیورات پر پابندی نہیں لگائی گئی تھی، حالانکہ ہمارے معاشرے میں برائی کی جڑ، یہی سونے کے زیورات ہیں، اور آج بھی معاشرے میں رشوت کی شرح میں اضافے کی مثال، سونے کی قیمت میں اضافے کے حوالے سے بیان کی جاتی ہے۔ کئی شریف لوگ محض اپنے اہل خانہ کو سونے کے زیورات، مہیا کرنے کے لئے رشوت کی لعنت میں گرفتار ہو چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت اسلامی نے مردوں اور عورتوں، دونوں کے لئے ان زیورات کا استعمال حرام قرار دے دیا تھا۔ ہمارے ہاں یہ عام غلط فہمی ہے کہ شریعتِ اسلامی میں، یہ زیور، صرف مردوں کے لئے حرام ہیں، عورتوں کے لئے جائز ہیں، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے، عورتوں کے لئے بھی بڑے واضح الفاظ میں انہیں حرام قرار دیا تھا۔ اور ان پر بار بار زور دیا کہ وہ صرف چاندی کے زیور استعمال کریں۔ آپ کے اس ارشادِ گرامی کی حکمت یہ تھی کہ

چاندی کے زیور امیر اور غریب دونوں خاندانوں کی عورتیں استعمال کر سکتی تھیں۔ ان ارشاداتِ رسول کو متعدد بار طلوعِ اسلام کے صفحات میں پیش کیا جا چکا ہے۔

قیامِ پاکستان سے پہلے اور کچھ عرصہ بعد تک، ملکِ عزیز میں زیادہ تر چاندی کے زیورات کا رواج تھا، اور غالباً یہ اسلامی تعلیمات کا اثر تھا۔ بعد میں ہمارے خوشحال طبقہ نے، سونے کے زیورات کو اس وسیع پیمانے پر رواج دیا کہ بیچارے غریب عوام کو بھی اس دوڑ میں شریک ہونا پڑا۔ اگر سونے کے مارکیٹ ریٹوں کو سامنے رکھا جائے، تو یہ اچھی بھلی آمدنی کے لوگوں کی پہنچ سے دُور دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن اپنے اہلِ خانہ کو خوش کرنے کے لئے اچھے بھلے لوگوں کو رشوت کا سہارا لینا پڑا، اس لئے اس لعنت کو ختم کرنے کے لئے سونے کے زیورات پر پابندی لازمی ہے۔ ہمارے پڑوسی ملک ہندوستان میں، اس قسم کی پابندی لگائی جا چکی ہے اور اہلِ ہند کے لئے، اس کے نہایت ہی مثبت نتائج نکلے ہیں۔

اس کے بعد، شادی بیاہ کے مواقع پر کھانے کے اخراجات کا مسئلہ آتا ہے۔ دس پندرہ سال پہلے تک ایسی تقریبات میں ایک تو مہمانوں کی تعداد محدود ہوتی تھی، دوسرے کھانوں کی تعداد بھی زیادہ سے زیادہ دو ہوتی تھی۔ لیکن اب نہ مہمانوں کی تعداد پر کوئی پابندی ہے اور نہ ہی کھانوں کی مختلف اقسام پر بلکہ اب ایک متوسط درجہ کی شادی کے موقع پر، اتنا کھانا ضائع ہو جاتا ہے، جو چند سال پہلے کی شادیوں کی پوری بارات کے لئے کافی ہوتا تھا۔ رشوت ختم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ کھانوں اور مہمانوں کی تعداد پر پابندی عائد کی جائے، کیونکہ ہمارے معاشرے کے صرف چند فیصد لوگ ہی ان اخراجات کے متحمل ہو سکتے ہیں۔ باقیوں کو رشوت کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اس سلسلے میں پرانے قانون کو دوبارہ نافذ کر دیا جائے تو مثبت نتائج حاصل ہو سکتے ہیں۔

دوسرے نمبر پر شاندار کوٹھیوں کا معاملہ ہے۔ جو کئی کئی کنالوں کے رقبوں پر تعمیر کی جا رہی ہیں۔ ان کوٹھیوں پر لاکھوں روپے کی لاگت آتی ہے اور ہمارے معاشرے کے معدودے چند افراد ہی اتنی لاگت کے متحمل ہو سکتے ہیں، لیکن بہت سے دوسرے لوگ، جو اپنی جائز آمدنی سے ایسی کوٹھیوں کے خواب بھی نہیں دیکھ سکتے، اس دوڑ میں شریک ہو چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس مقصد کے لئے انہیں آمدنی کے ناجائز ذرائع کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اسلام اس بارے میں سادگی کی تعلیم دیتا ہے۔ خود رسول اللہؐ نے اپنی ساری زندگی ایک سادہ سے مکان میں گزاری، اسلامی مملکت کا سربراہ ہونے کے باوجود اپنے لئے کوئی محل تعمیر نہ کرایا۔ آپ نے مومنوں کو بھی سادہ مکانات میں رہنے کی تلقین فرمائی، دورِ رسالت میں جب کوئی صحابی، اپنی حلال کی کمائی سے بھی کوئی شاندار عمارت تعمیر

کر لیتا تھا۔ تو آپ اس کا سماجی بائیکاٹ کر دیتے تھے۔ ہمارے پڑوسی ملک ہندوستان میں، اس قسم کی بڑی کوٹھیوں پر بہت پہلے سے پابندی لگائی جا چکی ہے اور کوئی بھی سرمایہ دار چاہے اس کا تعلق برلا اور ٹاٹا کے ارب پتی خاندانوں سے ہی کیوں نہ ہو، پونے دو کنال سے زیادہ کے رقبے پر اپنا مکان تعمیر نہیں کر سکتا۔ اسلامی تعلیمات بھی اس قسم کی پابندی کا تقاضا کرتی ہیں، اور اس پابندی سے رشوت ختم کرنے میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ عیش و عشرت کی تیسری بڑی مد، کاروں کی دوڑ ہے ہمارے ملک میں اس وقت کاروں کی جو تعداد ہے، آج سے دس پندرہ سال پہلے ان کا عشرِ عشیر بھی نہ تھا۔ لیکن اب کاروں کی کثرت کی وجہ سے صورتِ حالات یہ ہو چکی ہے کہ کسی مصروف سڑک کو پار کرنا، موت کو دعوت دینے کے مترادف ہو چکا ہے۔ ان کاروں کی درآمد پر ہی ہر سال اربوں روپے خرچ نہیں ہوتے، بلکہ انہیں چلانے کے لئے اربوں روپے کا پٹرول بھی باہر سے منگوانا پڑتا ہے، جس سے زرِ مبادلہ پہ بوجھ پڑنے کی وجہ سے عالمی مارکیٹ میں ہمارے روپے کی ساکھ پہ بڑا اثر پڑتا ہے۔ ہمارے پڑوسی ملک میں، غیر ملکی کاروں کی درآمد پہ کافی مدت سے پابندی عائد ہو چکی ہے۔ رشوت ختم کرنے کے لئے یہاں بھی ایسی ہی پابندی کی ضرورت ہے۔ کار رکھنے کی اجازت صرف ضرورتمند افراد تک محدود کر دی جائے۔ اور اس سلسلے میں مزید احتیاط برتتے ہوئے اگر پٹرول کی راشن بندی کر دی جائے۔ تو اس سے رشوت ختم کرنے میں بڑی مدد ملے گی۔

ہمارے نئے وزیر اعظم صاحب نے ملکِ عزیز سے رشوت کے خاتمے کے لئے جس عزم کا اظہار کیا ہے، یہ اقدامات اس سلسلے میں کافی ممد ثابت ہوں گے۔ امید ہے کہ صاحب موصوف ان تجاویز پر غور فرما کر، ان پر عمل کرنے کے بارے میں مناسب احکامات جاری کریں گے۔

لاہور کے سامعینِ درس متوجہ ہوں

درسِ قرآن بذریعہ وی سی آر (V-C-R) ہر جمعہ کی صبح ۸½ بجے ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور میں ہوتا ہے۔

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام

انسانی اعضاء کی پیوند کاری کے بارے میں رابطہ العالم الاسلامی کا فتویٰ

دو تین سال پہلے طلوعِ اسلام میں انسانی اعضاء کی پیوند کاری کے جواز کے بارے میں ایک مضمون شائع ہوا تھا، تو علماء کی جانب سے اس کے خلاف شور مچایا گیا تھا کہ انسان چاہے مردہ ہی کیوں نہ ہو، وہ کرامت کا مستحق ہے، اس کے اعضاء کاٹ کر زندہ انسانوں کو نہیں لگائے جا سکتے وغیرہ۔

اس سلسلے میں حال ہی میں رابطۂ العالم الاسلامی جس کا صدر دفتر مکہ مکرمہ میں ہے ایک فتویٰ جاری کیا گیا ہے، جو ہمارے علماء کو غور و فکر کی خصوصی دعوت دیتا ہے، یہ رابطہ ایک مشہور بین الاقوامی اسلامی ادارہ ہے، جس نے جدید مسلم معاشرے کو پیش آنے والے نئے نئے مسائل کے حل کے لئے ایک خصوصی ادارہ فقہ اکیڈیمی قائم کر رکھی ہے۔ جس میں ساری دنیا کے جید علماء کو شریک کیا گیا ہے۔ اس اکیڈیمی کا آٹھواں اجلاس، ابھی حال ہی میں مکہ مکرمہ میں ختم ہوا ہے، دوسرے مسائل کے علاوہ، انسانی اعضاء کی پیوند کاری کا مسئلہ بھی اس کے سامنے پیش ہوا۔

اکیڈیمی کی مجلسِ علماء نے اس بارے میں جو فتویٰ جاری کیا ہے۔ وہ بڑا ترقی پسندانہ ہے، یعنی فقہ کی کتابوں سے تو صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ مردہ انسانوں کے اعضاء زندہ انسانوں کی جان بچانے کے لئے، استعمال کئے جا سکتے ہیں، جب کہ مجلسِ علماء نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ اس مقصد کے لئے زندہ انسانوں کے اعضاء بھی استعمال میں لائے جا سکتے ہیں۔ اس فتویٰ کا ترجمہ علماء حضرات اور عام قارئین کے فائدے کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔ تاہم اس فتویٰ کا ترجمہ پیش کرنے سے پہلے، یہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس بارے میں شریعتِ اسلامی میں اس کی جو تفصیلات ملتی ہیں، ان کا خلاصہ بھی قارئین کی خدمت میں پیش کر دیا جائے۔

اسلامی ملک مصر میں یہ مسئلہ آج سے ستر سال پہلے، علماء کی ایک مجلس میں پیش کیا گیا تھا۔ مجلس کے ایک رکن، علامہ رشید رضا نے اس مسئلہ پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ اعضاء کی پیوند کاری کوئی نیا مسئلہ نہیں، فقہائے کرام نے، اسے صدیوں پہلے حل کر دیا تھا۔ یہاں تک

کہ اس مقصد کے لئے، انہوں نے انسانی اعضاء کی خرید و فروخت کی بھی اجازت دے دی تھی۔ شرط یہ تھی کہ اس عمل سے، مجبور و مریض انسانوں کو فائدہ پہنچے۔ اس کی تائید میں، انہوں نے حنبلی فقہ کے ایک مشہور امام ابن قدامہ کا یہ فتویٰ پیش کیا تھا۔

"اور انسان کے تمام اعضاء کی فروخت جائز ہے۔ کیونکہ غلام اور لونڈی کی فروخت جائز ہے اور آزاد آدمی کی فروخت اس لئے جائز نہیں، کہ وہ کسی کی ملکیت نہیں، اور زندہ انسان کے کاٹے ہوئے عضو کی فروخت کی بھی اجازت نہیں، کیونکہ اس سے کوئی نفع نہیں ہوتا۔"

(المغنی لابن قدامۃ جلد چہارم ص ۲۶)

علامہ رشید رضا نے، حنبلی فقہ کی اس معتبر کتاب کو، زمانۂ جدید کے معیار تحقیق کے مطابق دوبارہ مرتب کرا کے شائع کروایا تھا۔ اس فتویٰ کے نیچے وہ اپنا فٹ نوٹ ان الفاظ میں لکھتے ہیں۔

"یعنی انسان کے اعضاء کی فروخت، اس وقت جائز ہے، جب ان سے نفع اٹھایا جاوے۔ اور یہ ہمارے زمانے میں ممکن ہو گیا ہے، ڈاکٹر حضرات انسانی جسم کی جلد سے ایک ٹکڑا کاٹ کر بدن کے دوسرے حصے میں اس کی پیوند کاری کر دیتے ہیں۔"

ہمارے ہاں اس عمل کے خلاف سب سے بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے۔ کہ مردہ جسم کے کسی حصے کو کاٹنا، اس کی بے حرمتی کے مترادف ہے، لیکن ہماری فقہ کی کتابوں میں ایسی کئی مثالیں موجود ہیں، جو اس اعتراض کی نفی کرتی ہیں۔ فتاویٰ عالمگیری جو حنفی فقہ کی ایک معتبر کتاب ہے، اس میں یہ فتویٰ دیا گیا ہے:۔

"فتاویٰ ابوالاللیث میں مذکور ہے کہ عورت مر گئی، وہ حاملہ تھی۔ اور یقین ہو گیا کہ اس کے پیٹ کا بچہ زندہ ہے، تو عورت مذکور کا پیٹ بائیں طرف سے چاک کیا جائے۔ اس طرح اگر گمان غالب ہو، کہ اس کے پیٹ میں بچہ زندہ ہے تو بھی یہی حکم ہے" یہ محیط (فقہ کی کتاب) میں ہے۔

(فتاویٰ عالمگیری ترجمہ اردو جلد نہم ص ۱۰۷)

اس فتویٰ کے مطابق ایک انسانی جان کہ جس کی زندگی کا پورا یقین نہیں، اسے بچانے کے لئے، مردہ کے عضو کو کاٹنے کی واضح اجازت دی گئی ہے، اس سے بھی بڑھ کر ہمارے فقہائے کرام نے تو ایک زندہ انسان کو بچانے کے لئے، کسی مردہ نفس کو کہ جس کی موت کا پورا یقین بھی نہیں، کے اعضاء ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی اجازت بھی دی ہے۔ یہ فتویٰ بھی فتاویٰ عالمگیری سے ہی پیش کیا جاتا ہے:۔

"اگر کسی حاملہ عورت کے پیٹ میں بچہ، معترض ہو گیا یعنی بینڈا ہو کر جوڑ ان میں پڑ گیا، اور لوگوں کو بچے کے نکالنے کی کوئی راہ نہ معلوم ہوئی، سوائے اس کے کہ بچے کے عضو

جدا کر دیئے جائیں، اور اگر ایسا نہیں کرتے، تو ماں کی جان کا خوف ہے۔ تو منا شخ نے فرمایا، کہ اگر بچہ پیٹ کے اندر مر گیا تو ایسا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔" (ایضاً)

اس فتویٰ کے مطابق، ایک زندہ جان کو ہلاکت سے بچانے کے لئے، مردہ نفس کی اجازت کے بغیر، اس کے اعضاء کاٹنے بلکہ اسے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ دورِ جدید میں میڈیکل سائنس نے مصیبت زدہ انسانوں کو دائمی دکھ اور تکلیف سے بچانے کے لئے، ان مردہ انسانوں کے اعضاء کی پیوندکاری کا طریقہ رائج کیا ہے۔ یہ مردہ انسان، اپنی موت سے پہلے، ضرورت مند انسانوں کے نفع کے لئے، اپنے جسم کے بعض اعضاء، ان کی مصیبتیں دور کرنے کے لئے، استعمال کی اجازت دیتے ہیں۔ یہ اعضاء ویسے بھی موت سے چند دنوں کے بعد فنا ہو جاتے ہیں، لیکن اگر کسی مرنے والے نے اپنے عطیئے سے کسی دوسرے قریب المرگ انسان کو زندہ رکھنے میں مدد دی، تو وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یقیناً اجر کا مستحق ہوگا۔

ان تفصیلات کے بعد، اب اس موضوع پر رابطہ کے عربی فتویٰ کا ترجمہ ملاحظہ ہو:۔

اخبار العالم الاسلامی مکّہ مکرمہ بابت مورخہ ۲۵ فروری ۱۹۸۵ء کے صفحہ پانچ پر مرقوم ہے کہ اس مسئلہ پر مجلس فتویٰ کے اراکین کے درمیان سخت بحث ہوئی۔ اکیڈمی کے ڈائریکٹر جناب ڈاکٹر طلال نے فیصلہ دیا کہ جن اہلِ علم نے، انسانی اعضاء کی پیوندکاری کے جواز کے بارے میں استدلال کیا ہے، وہ قابلِ ترجیح ہے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ زندہ انسان کے جسم کا کوئی حصّہ لے کر، کسی دوسرے انسان کی زندگی بچانے کے لئے اس میں پیوند کرنا یا اس کے کسی ناکارہ عضو کو اس سے دوبارہ قابلِ عمل بنانا، شرعاً جائز ہے۔ یہ انسانی جسم کی کرامت کے خلاف نہیں ہے، کیونکہ اس میں ایک بڑی مصلحت ہے اور جس مصیبت زدہ انسان کی جان بچائی جا رہی ہے، اس کی اچھی مدد ہے، تاہم اس مقصد کے لئے مندرجہ ذیل شرائط کی پابندی لازمی ہے:۔

۱۔ جس زندہ شخص کا عضو استعمال کیا جا رہا ہے، وہ اس کے لئے ایسا نقصان دہ ثابت نہ ہو کہ اس کی زندگی کے لئے موجب ضرر ہو جائے۔ کیونکہ شرعی اصول یہ ہے کہ ضرر کو ضرر کے ذریعے دور نہیں کیا جا سکتا۔

۲۔ یہ کہ متعلقہ عضو، رضاکارانہ طور پر دیا جائے، اس بارے میں کوئی جبر نہ ہو۔

۳۔ ایسے عضو کی پیوندکاری، مجبور مریض کے علاج کا واحد ذریعہ ہو۔

۴۔ زندہ انسانوں کا عضو حاصل کرنا اور ضرورت مند کے جسم میں اس کی پیوندکاری کے عمل کی کامیابی کا غالب حد تک یقین ہو۔

(محمد ارمغان ثاقب)

ذکرِ پرویزؒ

پرویز صاحب علمی اور دینی حلقوں میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ آپ ادارہ طلوعِ اسلام کے بانی تھے۔ آپ نے قائداعظمؒ کے ایماء پر ۱۹۳۸ء میں "طلوعِ اسلام" رسالے کا اجراء کیا۔ اس کا مقصد تحریکِ پاکستان اور دو قومی نظریے کی تائید و حمایت کرنا اور اس کے مخالفین کا مقابلہ کرنا تھا۔ اس روز سے لے کر مرتے دم تک پرویزؒ صاحب دو قومی نظریے کی تشریح اور اسلام کی تبلیغ میں ہمہ تن مصروف رہے۔ علاوہ ازیں آپ کو نہ صرف یہ کہ علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ دونوں سے قرب حاصل رہا ——— بلکہ آپ ان چند خوش نصیب لوگوں میں سے تھے جو قائداعظمؒ سے وقت (APPOINTMENT) لئے بغیر مل سکتے تھے[1]

تحریکِ پاکستان کے ایک سرگرم کارکن ہونے کے علاوہ آپ ایک جیّد عالم دین اور نامور مفکرؒ بھی تھے۔ آپ نے اسلام پر پچاس سے زائد کتب تصنیف کیں۔ پرویز صاحب کی تمام تر دیدہ ریزیوں اور جگر سوزیوں کا نقطۂ ماسکہ یہ تھا کہ اسلام ایک مذہب نہیں بلکہ دینؔ ہے۔ مذہب انسان اور خدا کے درمیان محض ایک نجی تعلق کا نام ہے اور اس کو عملی زندگی اور اس میں درپیش مسائل سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ بڑی حد تک یہ رسوم کا مجموعہ ہوتا ہے ——— اس کے برعکس دین ایک نظامِ حیات کا نام ہے۔ یہ زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہے۔ خواہ مسائل سیاسی ہوں، معاشرتی ہوں یا معاشی ہوں یہ ان تمام کا حل پیش کرتا ہے۔ اور یہی چیز اسلام کو دیگر مذاہبِ عالم سے ممتاز کرتی ہے۔ دینِ اسلام کی کوئی بھی ایسی تعبیر و تشریح جو ان مسائل کو حل کرنے میں ناکام ہو جائے، اس دین کو مذہب بنا دینے کے مترادف ہے۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ حج، یہ تمام چیزیں رسوم نہیں کہ ان کو صرف ظاہراً ادا کر دیا جائے تو دین کا مدعا پورا ہو جائے گا۔ بلکہ ان ارکان کی غرض و غایت اصل چیز ہے۔ یہ ظاہری اعمال ضروری ہیں لیکن مقصود بالذات نہیں بلکہ کسی ارفع مقصد کی تکمیل کا ذریعہ ہیں ——— اگر غرض و غایت باقی نہ رہے تو اسلام رسوم کا گھوارہ بن جائے گا۔ دین کی بجائے مذہب بن جائے گا۔ مثلاً صلوٰۃ کا مقصد مسلمانوں میں

---

[1] یہ بات قائداعظمؒ محمد علی جناح کے صد سالہ جشنِ پیدائش کے سلسلے میں مولانا کوثر نیازی نے قومی اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے کہی تھی اور یہ بات اگلے روز اخبارات میں بھی آ گئی تھی۔

اتحاد، مساوات اور یک نگہی پیدا کرنا اور تفرقے کو مٹانا ہے۔ نیز اس چیز کا اقرار کرنا ہے کہ ہم عملی زندگی میں بھی اللہ کے احکام و قوانین کی اطاعت کریں گے۔ سجدہ و رکوع اسی چیز کے مظہر ہیں، غرض، نماز اطاعتِ خداوندی کی سمٹی ہوئی شکل (MINIATURE FORM) ہے۔ اگر عملی زندگی میں قوانینِ خداوندی کا اتباع نہیں کیا جاتا تو یہی نماز رسم بن کر رہ جاتی ہے۔

اسی طرح ان کا کہنا تھا کہ زکوٰۃ کی کوئی بھی ایسی تعبیر و تشریح جو لوگوں کے معاشی مسائل حل کرنے سے قاصر رہے، صحیح نہیں ہو سکتی۔ آپ نے عمر بھر اسلامی حکومت کی معاشی ذمہ داریوں پہ انحصار زور دیا۔ آپ کہا کرتے تھے کہ عوام کی معاشی کفالت اسلامی حکومت کی صرف ایک خاصیت ہی نہیں بلکہ یہ اسلامی حکومت کا طرۂ امتیاز ہے۔ پرویز صاحب عمر بھر قرآنِ پاک، سیرتِ رسولؐ اور آثارِ صحابہ کے ذریعے اس معاشی ذمہ داری کی بھرپور تشریح کرتے رہے۔ آپ نے سیرتِ فاروقی رضؓ پہ ایک قابلِ رشک کتاب "شاہکار رسالت" تصنیف فرمائی جس میں انتہائی رعنائی کے ساتھ حضرت عمر فاروق رضؓ کے طرزِ حکومت کے ذریعے اسلامی مملکت کی معاشی اور دیگر ذمہ داریوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔

دین کے فہم کے سلسلے میں پرویز صاحب، علامہ اقبالؒ سے بے حد متاثر ہوئے۔ آپ اقبالؒ کو اپنا عظیم محسن سمجھتے تھے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ پرویز صاحب اقبالؒ کے مستند شارح کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں آپ کی کتاب "اقبال اور قرآن" ایک زندۂ جاوید شاہکار ہے اور اس کی توصیف کے لئے میں اپنی زبان کو عاجز پاتا ہوں کہ محض ستائش کے الفاظ اس کتاب کے حسن کی کما حقہ عکاسی نہیں کر سکتے۔ پرویز صاحب جہاں فکرِ قرآنی کا ذکر کرتے، وہاں اقبالؒ کا ذکر ضرور آتا۔ اور جہاں اقبال کا ذکر آتا وہاں قرآن کا ذکر ضرور ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ فکرِ اقبالؒ کا سرچشمہ قرآن تھا اور اقبال کو وہی سمجھ سکتا ہے جو قرآن پر گہری نظر رکھتا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبالؒ اور پرویز صاحب کے نظریات میں بے حد مماثلت پائی جاتی ہے۔

اگر آپ علامہ اقبالؒ اور پرویز صاحب کے، قوانین سازی، معاشی نظام اور تقدیر کے بارے میں نظریات کو یک نظر دیکھیں تو آپ کو خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ دونوں کے خیالات میں کس قدر اشتراک پایا جاتا ہے..... اس کی وجہ فقط اور فقط یہ ہے کہ ان دونوں کی فکر کا سرچشمہ قرآن تھا......

یہاں ایک اور گوشے کی طرف توجہ دلانا ناگزیر ہے۔ وہ یہ کہ باوجود اس کے کہ اقبالؒ سے پرویز صاحب کو والہانہ عقیدت و محبت تھی۔ ان سے گہرا ذہنی اور قلبی لگاؤ تھا۔ جہاں بھی انہوں نے محسوس کیا کہ اقبالؒ کی فلاں بات خلافِ قرآن ہے، آپ نے نہ صرف اس سے اختلاف کیا بلکہ اس پہ بھرپور تنقید بھی کی۔ کیونکہ ان کے نزدیک دین میں کسی انسان کو سند و حجت

حاصل نہیں ہے۔ اقبالؒ بھی بالآخر انسان تھے وہ غلطی کر سکتے تھے۔ پرویز صاحب نے تصوف کے موضوع پر ایک کتاب "تصوف کی حقیقت" تصنیف کی جس میں انہوں نے باقاعدہ ایک باب "اقبالؒ اور تصوف کے عنوان سے مختص کیا ہے۔ اس باب میں اقبالؒ کے کچھ اشعار و خیالات پر سخت تنقید کی گئی ہے، یاد رہے کہ تصوف کے متعلق اقبالؒ کے نظریات ہمیشہ ہی متنازعہ رہے ہیں بھی زمانے میں وہ تصوف کے دلدادہ تھے۔ پھر ایک زمانہ آیا کہ وہ اس کو مسلمانوں کے زوال کا سبب سمجھنے لگے۔ اسی زمانے میں انہوں نے "تصوف شعبدہ بازیوں کی کمند" جیسا مضمون تحریر کیا اس کے علاوہ وہ تصوف کو اسلام کی سرزمین میں "اجنبی پودا" کہا کرتے تھے۔ اور اس کے بعد عمر کے آخری حصے میں پھر اسی طرف آ گئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بہر حال یہ پرویز صاحب کی دیانتداری کی دلیل ہے کہ انہوں نے اگر اقبالؒ کی بات بھی غلط سمجھی تو اس پر بلا جھجک تنقید کی۔

پرویز صاحب تمام عقائد و نظریات کو قرآن کی کسوٹی پر پرکھنے کے قائل تھے۔ بعض سطح بین لوگ اس کو انکارِ حدیث پر محمول کر لیتے ہیں۔ لیکن ایسا سمجھنا درست نہیں۔ اصل حقیقت یوں ہے کہ نظریات و عقائد تو قرآن ہی کے عطا کردہ ہیں، حضور پاکؐ یا صحابہ کرامؓ نے کوئی نیا نظریہ یا عقیدہ امت کو نہیں دیا بلکہ قرآن ہی کے عطا فرمودہ نظریات عقائد و احکام کی تشریح کی ہے۔ آپ نے احادیث اور مسلمانوں کی تاریخ کو قرآن کی کسوٹی پر پرکھا اور ایسی ہر روایت اور بیان کو وضعی قرار دیا جو قرآن کریم کے خلاف جاتا ہو یا جس سے ذاتِ رسالت مآبؐ یا حضرات صحابہ کرامؓ کی ذات پر طعن وارد ہوتا ہو۔ جو روایات نہ قرآن کے خلاف ہیں اور نہ ہی ان سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مقدسہ پر کسی قسم کا حرف آتا ہے، انہیں وہ صحیح مانتے تھے۔ اس بات کی شہادت ان کی تمام کتابوں میں ملتی ہے۔ تحقیق کی خاطر "شاہکارِ رسالت" ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

پرویز صاحب کہا کرتے تھے کہ دین کا مقصد یہ ہے کہ وہ انسانوں کو دوسرے انسانوں کی محکومی سے چھڑا کر ان سے خالص قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرائے۔ قوانین کی یہ اطاعت ایک نظامِ مملکت کی رُو سے ہو سکتی ہے اس کے بغیر دین متمکن نہیں ہو سکتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے دین کا یہ نظام قائم فرمایا۔ اس نظام میں قرآنِ کریم کے احکام و قوانین کی اطاعت کرائی جاتی تھی اور جن امور میں قرآنِ کریم نے صرف اصول دیئے ہیں۔ ان کی چاردیواری کے اندر رہتے ہوئے امورِ مملکت امت کے مشورہ سے سرانجام پاتے تھے۔ رسول اللہؐ کے بعد دین کا یہ نظام حضورؐ کے خلفائے راشدین نے جاری رکھا۔ اس میں امورِ مملکت سرانجام پانے کا وہی طریقہ تھا جو رسول اللہؐ کے زمانہ میں رائج تھا۔ بدقسمتی سے خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کا یہ سلسلہ کچھ عرصہ کے بعد منقطع ہو گیا اور دین کا نظام باقی نہ رہا۔ ہمارے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ پھر سے خلافت

علیٰ منہاجِ رسالت کا سلسلہ قائم کیا جائے۔ آج اگر ایسی خلافت یا اسلامی حکومت قائم ہو تو اس کے پیشِ نظر بھی قانون سازی کا وہی اصول ہوگا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم والذین معہٗ کے زمانہ میں رائج تھا۔ یعنی وہ احکام و قوانین جو قرآنِ کریم میں مذکور ہیں ان کی اطاعت کرائی جائے گی اور جن امور میں قرآن کریم نے صرف اصول دیئے ہیں ان کی جزئیات قرآنی اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے ملّت کے مشورہ سے طے کی جائیں گی۔ اس سلسلے میں حضور پاکؐ یا خلفائے راشدینؓ کے دور کے وہ فیصلے یا جزئیات جو اس زمانے کے حالات سے مشروط تھیں، خلافت علیٰ منہاجِ نبوّت انہیں وقت کے تقاضوں کے مطابق تبدیل کر سکتی ہے، لیکن یاد رہے کہ ایسا کرتے وقت قوانین کی روح تو بدستور قائم رہے گی۔ صرف جزئیات تبدیل ہوں گی۔ بالفاظِ دیگر قوانینِ اسلام میں قانونِ ثبات وتغیّر (LAW OF PERMANENCE AND CHANGE) کارفرما ہوگا۔ جس میں ثبات اصولوں کو حاصل ہوگا اور تبدّل جزئیات کو۔ اس کے علاوہ اسلامی حکومت، قرآن اور پچھلے ادوار میں کئے گئے فیصلوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے نئے فیصلے بھی کر سکتی ہے ...... نئے قوانین مرتب کر سکتی ہے۔ آپ اس کی تائید میں حضرت عمر فاروقؓ کے دورِ حکومت کو بطورِ مثال پیش کیا کرتے تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے حضور پاکؐ کے دور میں کئے گئے فیصلوں کو برقرار رکھا لیکن ساتھ ہی جن فیصلوں کو زمانے کے تقاضوں کے مطابق بدلنا پڑا انہیں بدلا۔ نیز کئی نئے اقدامات کئے۔ اس اجمال کی تفصیل "شاہکارِ رسالت" میں صـ۲۸۰—۲۷۷ پر ملے گی۔ پرویز صاحب کہا کرتے تھے کہ صرف اسی طرح اسلام تمام زمانوں کے لئے دین کہلا سکتا ہے اور دنیا میں نافذ ہو سکتا ہے۔ اگر ہم نے کسی زمانے میں طے کردہ جزئیات کو ناقابلِ تغیّر سمجھ لیا تو اسلام کبھی بھی اس دنیا میں عملاً نافذ نہ ہو سکے گا۔ بطورِ سند تو نہیں لیکن اطلاعاً عرض ہے کہ اقبالؒ کا بھی یہی نقطۂ نظر تھا۔ ملاحظہ ہو "خطباتِ اقبال" (صـ۱۶۴—۱۶۳)

میں اس حقیقت کا ایک مرتبہ پھر اعادہ کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ موضوع زیرِ بحث شدّت سے اس کا متقاضی ہے کہ پرویز صاحب قطعاً منکرِ حدیث یا منکرِ شانِ رسالت نہیں تھے۔ انہوں نے کبھی بھی یہ نہیں کہا کہ یہ سارا سرمایہ بیکار ہے اور ہر اس حدیث کو صحیح سمجھتے تھے جو قرآن کریم کے مطابق ہو یا جس سے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابۂ کبارؓ کی سیرت داغدار نہ ہوتی ہو۔ آپ نے اپنی کتب میں جابجا احادیث نقل فرمائی ہیں اور ان سے استدلال کیا ہے۔ پرویز صاحب نے حضور پاکؐ کی سیرت پر گرانقدر کتاب "معراجِ انسانیت" تحریر فرمائی ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے قارئین اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آپ کو حضور پاکؐ سے کس قدر محبت تھی۔ اس کتاب میں آپ نے جابجا احادیث تحریر فرمائی ہیں۔

میں پرویز صاحب کے سلسلے میں آپ کی توجہ ایک ایسے پہلو کی طرف مبذول کراؤں گا کہ آپ

حیران و ششدر رہ جائیں گے کہ پرویز صاحب کو رسول پاکؐ سے قلبی لگاؤ کس نوعیت کا تھا "شاہکارِ رسالت" کے آغاز میں آپ نے ایک مختصر سا باب "گذرگاہِ خیال" کے نام سے تحریر کیا ہے۔ اس میں آپ نے اپنی ابتدائی زندگی کا ہلکا سا خاکہ پیش کیا ہے۔ اس میں پرویز صاحب لکھتے ہیں کہ جب انہوں نے اسلام کا مطالعہ کیا تو اس میں اس قدر غیر اسلامی نظریات و افکار کی بھرمار تھی کہ ان کے دل میں اسلام کے متعلق شکوک و شبہات پیدا ہونے لگے اور جب آپ نے مزید مطالعہ کیا تو جو ان پر گذری وہ پرویز صاحب ہی کی زبانی سنیئے،

"ان حالات میں عین ممکن تھا کہ میں اسلام سے برگشتہ ہو جاتا لیکن میری انتہائی خوشبختی کہ اس ورطہ "لا" میں ایسا جاذبہ موجود رہا جو ان تلاطم خیزیوں میں میری کشتی کا لنگر بن گیا اور وہ جاذبہ تھا۔ حضور نبی اکرمؐ کی ذاتِ اقدس و اعظم کے ساتھ میری بے پناہ عقیدت ہی نہیں محبت، میرا ایمان تھا کہ ایسی عظیم ہستی جس نے انسانوں کی داخلی اور خارجی دنیا میں ایسا تحیر انگیز انقلاب برپا کر دیا تھا نہ تو (معاذ اللہ) فریب خوردہ ہو سکتی ہے نہ فریب کار۔ اس لئے جب آپ نے فرمایا ہے کہ قرآن مجید نہ میری نہ کسی اور انسان کی فکر کی تخلیق ہے بلکہ یہ خدا کا کلام ہے تو مجھے اس دعوے کو یونہی نہیں جھٹک دینا چاہیئے۔ انتظار کرنا چاہیئے تاکہ میں قرآن کو خود سمجھنے کے قابل ہو جاؤں۔ بس یہ تھا ایک سہارا (اور کس قدر محکم سہارا) جس نے مجھے ان طوفانوں میں تھامے رکھا اور میرے پاؤں میں لغزش نہ آنے دی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سے کم کشش کی کوئی قوت مجھے اس ورطہ میں سنبھال نہیں سکتی تھی۔ سچ ہے۔ ؎

تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رَو
عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام

کس قدر احسانِ عظیم ہے اس ذرۂ ناچیز پر اس آفتابِ عالمتاب کا، جس کی رحمۃ للعالمینی کے تصدق مجھے منزل ملی، مقام ملا، مدعا ملا.....؎

کوثر چکد از لبم، بایں تشنہ لبی | خادر دمد از شبنم، بایں تیرہ شبی
اے دوست ادب، کہ در حریم دل ماست | شاہنشہِ انبیاء، رسولِ عربی

اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ ۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا (٣٣/٥٦)"

یہ تھی کیفیت پرویز صاحب کے حُبِّ رسول کی۔ اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حقیقت اور پروپیگنڈے میں کس قدر فرق ہے۔

پرویز صاحب نے اپنے خلاف برپا کئے جانے والے تمام طوفانوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ یہ آپ کا عزم و استقلال تھا کہ آپ آخری سانس تک اسلام کی خدمت کرتے رہے۔ ان کے عزم و ہمت کا اندازہ وہ لوگ اچھی طرح کر سکتے ہیں جو ان سے اسی سال کی عمر میں ملے ہوں

یا اس دور کی کوئی تقریر انہوں نے سنی ہو، ان کی آواز، اندازِ گفتگو، اور یادداشت کو دیکھ کر کوئی شخص یہ یقین کر ہی نہیں سکتا تھا کہ آپ کی اتنی زیادہ عمر ہے۔

۱۴ اگست ۱۹۸۴ء، یومِ آزادی کے موقع پر میں پرویز صاحب کی تقریر سننے گیا تو وہ اس وقت بیمار تھے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ یکایک کمرے کا دروازہ کھلتا ہے، اس میں سے ایک انتہائی ضعیف انسان نکلتا ہے اس کو دو آدمیوں نے سہارا دے رکھا ہے۔ وہ بمشکل تمام کرسی تک پہنچتے ہیں..... کمزوری بیان سے باہر ہے۔ لگتا نہیں تھا کہ تقریر تو کجا چند منٹ بول بھی سکیں گے۔ لیکن نہیں... تقریر شروع ہوتی ہے..... چیخنا چلانا نہیں ہے..... شور شرابا نہیں ہے...... جوں جوں وقت گذرتا جا رہا تھا نہ جانے ہمیں کیا ہوتا جا رہا تھا۔ وہی دھیما انداز...... ٹھہر ٹھہر کر بولنا..... حضرت عمر فاروق رضؓ کے وہی کارنامے جو ہم ہمیشہ سے سنتے چلے آ رہے تھے لیکن نہ جانے کیا تاثیر تھی ان کے الفاظ میں...... ان کے قلب سے پھوٹنے والی وہ کون سی شعاعیں تھیں جو ہمارے قلوب میں تیر کی مانند چبھتی جا رہی تھیں...... کیا بتاؤں کیوں ہم پر رقت طاری ہوتی جا رہی تھی..... کچھ معلوم نہیں کوئی پتا نہیں..... ابھی محفل پر رنگ آنے لگا تھا کہ کچھ لوگوں کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ پرویز صاحب عرصۂ دراز تک قرآن پاک کا درس دیتے رہے۔ اور درس دیتے وقت آپ پر اکثر رقت طاری ہو جایا کرتی تھی۔ اور جب آپ آنسو برداشت کرنے کی کوشش کرتے تو آپ کا چہرہ سرخ ہو جاتا اور یہ چیز آپ کے باوقار چہرے کو مزید دلکش اور متاثر کن بنا دیتی تھی۔ اور آپ کی بات تیر کی مانند دل میں اتر جاتی۔

پرویز صاحب نے اپنی ساری عمر جس کوہ کنی، جوئے شیر برآری اور خارہ شگافی میں گزار دی آپ اس کے لئے جس انعام و صلے کے متمنی تھے، اسے انہی کی زبانی سُن لیجئے:۔

"اگر میری ان کوششوں سے چند نفوس بھی ایسے پیدا ہو گئے جن کے دل میں قرآن کی رہنمائی کا یقین علیٰ وجہ البصیرت ابھر آیا تو میں سمجھوں گا کہ مجھے میری دیدہ ریزیوں اور جگر سوزیوں کا صلہ مل گیا"

(انسان نے کیا سوچا صـ ۱)

میں اس آس پہ سلگا رہا ہوں کہ دل کو
کبھی تو آگ بھڑکے گی کبھی تو روشنی ہوگی

تبصرہ کتب

(تبصرہ کیلئے ہر کتاب کی دو جلدیں ارسال فرماویں)

نام کتاب :۔ اسلامی ریاست کا عدالتی نظام
مصنف :۔ پروفیسر رفیع اللہ شہاب
شائع کردہ :۔ قانونی کتب خانہ کچہری بازار لاہور
صفحات :۔ ۲۴۸ ، قیمت ۲۵/- روپے

دورِ حاضر کے پیچیدہ مسائل کو اسلامی تعلیمات کے مطابق سمجھنے اور ان کا حل تلاش کرنے کی نظریاتی اور عملی کاوش، ایک عالمی تحریک بن کر ابھر رہی ہے، پاکستان میں معیشت، عدل و انصاف اور دیگر سیاسی اور معاشرتی اداروں کی، اسلامی اصولوں کے مطابق تشکیلِ نو کا عمل بڑی تیزی سے جاری ہے، علماء محقق، دانشور اور ادیب بھی اپنے رشحاتِ فکر کے ذریعے، اس تحریک کی کامیابی کے لئے کوشاں ہیں، پروفیسر رفیع اللہ شہاب کی تازہ ترین تصنیف "اسلامی ریاست کا عدالتی نظام" اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے دورِ رسالت سے لے کر زمانہ حاضر تک، اسلامی نظام عدل کے ارتقاء اور کارکردگی کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے اور تاریخی حقائق کی روشنی میں، اس نظام کے احیاء کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔

کتاب کے پہلے باب میں، قبل از اسلام جو عدالتی نظام، دنیا میں رائج تھے، ان کی جھلک پیش کی گئی ہے، اس باب میں اہلِ عرب و یہود، یونانی، ہندی، رومی اور ایرانی عدالتی نظام کی تفصیل دی گئی ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام سے پہلے، مختلف تہذیبوں اور معاشروں میں انصاف، اہلِ اقتدار کے تابع تھا۔ حاکمِ وقت کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ، قانون کا درجہ رکھتے تھے، معاشرے میں طبقاتی امتیاز کے باعث قانون کا دہرا معیار نافذ تھا، اور محکوم، انصاف کے نام پر ظلم و تعدی کی چکی میں پسنے پر مجبور تھے۔ اسلام میں نظامِ عدل کی بنیاد، خدا کی وحدانیت اور انسانی مساوات پر ہے، اسلام نے

رنگ نسل اور دیگر طبقاتی امتیازات و مراعات کو یک قلم موقوف کر دیا۔ مصنف نے اسلامی نظامِ عدل، اسلامی حکومت، اسلامی جمہوریت کا تصور۔ نظامِ عدل نافذ کرنے کے لئے شرائط پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

اس کے بعد دوسرے، تیسرے اور چوتھے باب میں تاریخ کے مختلف ادوار میں، اسلامی نظامِ عدل کے نفاذ اور کارکردگی کا جائزہ لیا گیا ہے۔ خلافتِ راشدہ کے بعد دورِ ملوکیت کے آغاز سے نظامِ عدل میں بگاڑ پیدا ہونا شروع ہوا اور کئی طرح کی خرابیوں اور مکروہات نے جڑ پکڑ لی۔ تاہم زوال کے اس دور میں، حضرت امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ، امام مالکؒ، امام جعفر صادقؒ نے اسلامی شریعت کے اصلی جوہر کو زندہ و تابندہ رکھنے کی کوشش کی اور تمام حقائق و شواہد کی چھان پھٹک کے بعد، قرآن و سنّت کی روشنی میں فقہِ اسلامی کی تدوین کی تا کہ آئندہ نسلوں کو رہنمائی میں کوئی رخنہ باقی نہ رہے۔

آخر میں مصنف نے پاکستان میں اسلامی عدالتی نظام کے نفاذ کی مختلف کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے پاکستان میں عائلی قوانین کے نفاذ کے تجربے کے بارے میں تفصیلی بحث کی۔ مصنف کا خیال ہے کہ پاکستان میں اسلامی قوانین کی صحیح تدوین، قاضیوں کی تربیت کا اہتمام اور اجتہاد کی روایت کے احیاء سے اسلامی عدالتی نظام قائم اور کامیاب ہو سکتا ہے۔

یہ کتاب علماء، وکلاء، مصنفین اور حکام کی خاص توجہ کی مستحق ہے۔ تا کہ وہ اس کے مطالعے سے اسلامی انصاف کے تقاضوں کو سمجھ سکیں اور اسلامی قانون کی عملداری میں صحیح کردار ادا کر سکیں۔ مولف کا اندازِ بیان مؤثر اور دلنشیں ہے۔ ہر بات مدلل طور پر مستند حوالوں کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔ اسلامیات کے سرمائے میں یہ ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔

(تبصرہ۔ نور محمد)

روزہ کے احکام

چونکہ رمضان المبارک کے مہینہ کا آغاز ہو رہا ہے۔ اس لئے (معمول کے مطابق) قرآن کی رُو سے روزے کے احکام مختصر الفاظ میں بیان کئے جاتے ہیں۔ یہ احکام[1] سورۂ بقرہ میں آئے ہیں۔ متعلقہ آیات یہ ہیں۔

(۱) يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ كُتِبَ عَلَيْكُمُ ٱلصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى ٱلَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝

(۱) اے پیروانِ دعوتِ ایمانی: جس طرح تم سے پچھلی قوموں پر روزہ فرض کیا گیا تھا۔ اسی طرح تم پر بھی روزہ فرض کیا گیا ہے تاکہ تم قانونِ خداوندی کی نگہداشت کر سکو۔

(۲) أَيَّامًا مَّعْدُودَٰتٍ

(۲) یہ روزے چند گنے ہوئے دنوں کے ہیں۔

(۳) فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ۔

(۳) پھر جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو وہ دوسرے دِنوں میں روزے رکھ کر گنتی پوری کر دے۔

(۴) وَعَلَى ٱلَّذِينَ يُطِيقُونَهُۥ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ۔

(۴) اور جو لوگ بہ دشواری روزے رکھ سکیں، ان کے لئے روزے کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا کافی ہے۔

(۵) فَمَن تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُۥ وَأَن تَصُومُوا۟ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ۔

(۵) اس کے بعد اگر کوئی اپنی خوشی سے زیادہ کرلے تو مزید اجر کا موجب ہو گا۔ اگر تم سمجھ بوجھ رکھتے ہو تو تمہارے لئے روزہ رکھنا بہتر ہے۔

(۶) شَهْرُ رَمَضَانَ ٱلَّذِىٓ أُنزِلَ فِيهِ ٱلْقُرْءَانُ۔

(۶) روزے رمضان کے مہینے کے ہیں جس میں قرآن نازل کیا گیا ہے۔

---

[1] ان احکام کو اس سے پہلے بھی ہم کئی بار درج کر چکے ہیں۔ لیکن قارئین کے تقاضے کے پیشِ نظر انہیں دہرایا جا رہا ہے۔

(۷) فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۖ وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ۔ (۱۸۳ - ۱۸۵ / ۲)

(۷) لہٰذا، تم میں سے جو کوئی اس مہینے میں اپنے گھر پر موجود ہو تو اسے اس مہینے کے روزے رکھنے چاہئیں۔ البتہ اگر تم میں سے کوئی بیمار یا سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرے۔

(۸) وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ۔ (۲/۱۸۷)

(۸) اور کھاؤ پیو، یہاں تک کہ تمہارے لئے صبح کی سفید دھاری سیاہ دھاری سے متمیز ہو جائے۔ پھر رات تک روزہ پورا کرو۔

(۹) أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ۔ (۲/۱۸۷)

(۹) اور تمہارے لئے روزوں کی راتوں میں اپنی بیویوں سے اختلاط حلال کیا گیا ہے۔

ان آیات سے معلوم ہو گیا کہ

۱۔ روزے رمضان کے مہینے کے ہیں (تین دن یا نو دن کے نہیں، بلکہ پورے مہینے کے)۔

۲۔ روزے ہیں، اس وقت سے لے کر جب صبح کی سفیدی نمودار ہو جائے، دن کے ختم ہونے تک کھانا، پینا اور بیوی سے اختلاط منع ہے۔

۳۔ روزے اس کے لئے ہیں کہ جو اس مہینے میں اپنے گھر پر موجود ہو اور تندرست ہو۔ مریض تندرست ہونے پر اور مسافر سفر سے واپسی پر دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر گنتی پوری کر دے۔

۴۔ اب ایک شکل اور باقی رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ ایک شخص (عام عرفی معنوں میں) نہ تو بیمار ہے نہ مسافر ہے لیکن کسی وجہ سے، اسے روزے رکھنے دشوار ہیں۔ مثلاً ایک بوڑھا آدمی اپنے گھر پر موجود ہے اور مریض بھی نہیں۔ لیکن بڑھاپے یا کسی مزمن مرض کی وجہ سے کمزور اتنا ہے کہ بمشکل روزہ رکھ سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ رمضان کے بعد دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر گنتی پوری کر دے۔ ایسے لوگوں کا حکم آیت نمبر ۴ میں بیان کر دیا گیا ہے کہ جو لوگ ایسے ہوں کہ بہ مشکل روزہ رکھ سکتے ہیں، انہیں اپنے آپ کو دشواری میں ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ وہ روزے کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔

غور فرمائیے کہ اوپر کی تینوں شقوں میں ہر قسم کے حالات جمع ہو گئے ہیں اور یہی احکام کی جامعیت کا تقاضا تھا۔

ہم نے وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ، کا ترجمہ —— وہ لوگ جو بہ دشواری روزہ رکھ سکیں —— کیا ہے۔ لیکن اس کا عام ترجمہ —— اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں —— کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ترجمہ صحیح نہیں۔ اس لئے کہ اس ترجمہ کی رُو سے مطلب یہ ہوگا کہ جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں وہ تو ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں اور جن میں روزہ رکھنے کی طاقت نہ ہو وہ روزے رکھا

کریں۔ ظاہر ہے کہ قرآن کا منشا یہ نہیں ہو سکتا۔ بات یہ ہے کہ لفظ " طاقت " کا جو مفہوم ہمارے ہاں اُردو میں رائج ہے وہ اس سے مختلف ہے جو عربی زبان میں اس کا مفہوم ہوتا ہے۔ اس کے لئے عربی زبان کی لغات دیکھئے۔ محیط المحیط جلد دوم صفحہ ۱۳۰۴ میں ہے۔

"طاقت کے معنی کسی چیز پر قدرت رکھنا ہیں لیکن یہ قدرت کی ایسی مقدار کو کہتے ہیں جسے انسان بہ مشقت کر سکتا ہے۔ دراصل یہ لفظ اُس طوق سے ماخوذ ہے جو کسی چیز کو اپنے گھیرے میں لے لیتا ہے: لَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ کے معنی یہ نہیں کہ جس کی ہمیں قدرت نہ ہو بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس کا بجا لانا ہمیں دشوار ہو۔"

اسی طرح عربی کی مشہور لغت لسان العرب صفحہ ۱۰۳ جلد ۱۲ میں ہے کہ

طاقت، قدرت کی اس مقدار کا نام ہے جو کسی انسان کے لئے بہ مشقت کرنا ممکن ہو۔

مفتی محمد عبدہ، اپنی تفسیر المنار صفحہ ۱۵۵ جلد ۲ میں فرماتے ہیں کہ

اِطَاقَةٌ دراصل مَكِنَتٌ اور قُدْرَتٌ کے بالکل ادنیٰ درجہ کا نام ہے۔ چنانچہ عرب أَطَاقَ الشَّيْءَ صرف اس وقت کہتے ہیں جب اس کی قدرت نہایت ہی ضعیف ہو۔ یعنی بہ دشواری اُسے برداشت کر سکتا ہو۔ چنانچہ يُطِيقُوْنَهٗ سے مراد بوڑھے، ضعیف اور اپاہج لوگ ہیں جن کے اعذار کے دور ہو جانے کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اور وہ لوگ ہیں جو انہیں کی طرح معذور ہیں۔ یعنی ایسے کام کاج کرنے والے لوگ جن کی معاش خدا نے پُر مشقت کاموں میں رکھ دی ہے۔ اسی بنا پر امام راغبؒ نے لکھا ہے کہ طاقت قدرت کی اس مقدار کا نام ہے جس کا کرنا انسان کے لئے بہ مشقت ممکن ہو۔

اس کی تائید تفسیر کشاف سے بھی ہوتی ہے جس میں لکھا ہے کہ

طَاقَةٌ کے مفہوم میں وہ کام آتے ہیں جنہیں بہ تکلیف یا بہ مشقت کیا جا سکے اور وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ سے مراد بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں ہیں جن کے لئے روزہ نہ رکھ کر فدیہ دینے کا حکم ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر یہ آیت ثابت ہے، منسوخ نہیں ہے۔ (تفسیر کشاف ص ۲۵۵ جلد ۱)

تفسیر روح المعانی میں ہے کہ

عربی زبان میں اَلْوُسْعَ کا لفظ اس قدرت کا نام ہے جو سہولت کے ساتھ ہو اور طَاقَةٌ کا لفظ اس قدرت کا نام ہے جو شدّت اور مشقت کے ساتھ ہو۔ لہٰذا، (آیۂ زیرِ نظر) کے معنی یہ ہوں گے۔ اور ان لوگوں پر جو شدت اور مشقت کے ساتھ روزہ رکھ سکتے ہیں، ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا ہے۔

(روح المعانی صفحہ ۵۹، جلد ۲)

تصریحاتِ بالا سے آپ نے دیکھ لیا کہ عربی زبان میں لفظ " طَاقَةٌ " کا مفہوم کیا ہے اور اس بنا پر وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ کا ترجمہ ـــــ اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں ـــــ صحیح نہیں ہو سکتا! اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ ـــــ جو لوگ بہ دشواری روزہ رکھ سکیں۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں، قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ وہ ایک اصول بیان کر دیتا ہے اور اُسے اُمت کے اجتماعی نظام پر چھوڑ دیتا ہے کہ وہ اس کی جزئیات خود متعین کرلے۔ چنانچہ عَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ، میں بھی یہی اسلوب اجتماعی اختیار کیا گیا ہے۔ یہاں ایک اصول بیان کر دیا گیا ہے اور اس کی تفصیلات خود بیان نہیں کیں (کہ وہ لوگ کون ہیں جو یہ مشقت روزہ رکھ سکتے ہیں) اس کی تفاصیل پہلے بھی متعین کی جا چکی ہیں اور ان پر اب بھی غور کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ علامہ قرطبی کی کتاب "جامع احکام القرآن" (صفحہ ۲۶۸ - ۲۶۹ - جلد ۲) میں ہے کہ

تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں جو روزہ رکھنے کی طاقت ہی نہیں رکھتے، یا شدید مشقت کے ساتھ طاقت رکھتے ہیں، ان کے لئے روزہ نہ رکھنا جائز ہے۔ مگر اس میں اختلاف ہے کہ ایسے لوگوں کے ذمہ کیا ہے؟ چنانچہ امام ربیعؒ اور امام مالکؒ نے کہا ہے کہ ان کے ذمے کچھ بھی نہیں۔ البتہ امام مالکؒ نے کہا ہے کہ اگر یہ لوگ روزانہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں تو میرے نزدیک یہ پسندیدہ ہے۔ اور حضرت انسؓ، ابن عباسؓ، قیسؓ بن السائب اور ابو ہریرہؓ نے فرمایا ہے کہ ــــ ان لوگوں کے ذمہ فدیہ ہے، قضا نہیں ہے۔

مفتی سید محمد عبدہٗ نے اور بھی اضافہ فرمایا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:-

اَلَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ سے یہاں مراد بوڑھے، ضعیف اور اپاہج لوگ ہیں جن کے اعذار کے دور ہو جانے کی امید نہیں ہوتی۔ ایسے ہی وہ لوگ بھی ان کے زمرے میں شمار ہوں گے جو مزدوری پیشہ ہوں۔ جن کی معاش خدا نے پُرمشقت کاموں میں رکھ دی ہے۔ مثلاً کانوں سے کوئلہ نکالنے والے اور وہ مجرم جن سے قید خانوں میں مشقت کے کام لئے جاتے ہیں، اور جن پر روزہ رکھنا گراں ہو۔ تیسری قسم کے وہ لوگ ہیں جن پر کسی ایسی وجہ سے جن کے دُور ہو جانے کی کوئی امید نہ ہو، روزہ رکھنا گراں گزرتا ہو جیسے بڑھاپا اور پیدائشی کمزوری اور ہمیشہ محنت کے کاموں میں مشغولیت اور پرانی بیماری جس کے اچھا ہونے کی امید نہ ہو، ایسے ہی وہ شخص جس کی مشقت کا سبب ہوتا رہتا ہے۔ جیسے حاملہ عورت اور دودھ پلانے والی عورت، ان سب لوگوں کے لئے جائز ہے کہ وہ روزہ کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔ اتنا کھانا جو ایک اوسط درجے کی خوراک کے آدمی کا پیٹ بھر سکے۔ (تفسیر المنار۔ صفحہ ۱۵۵-۱۵۷۔ جلد ۲)

یہ ہیں روزوں کے احکام قرآنِ کریم کی رُو سے۔ ہم نے صرف احکام سے بحث کی ہے۔ روزے کا فلسفہ بیان نہیں کیا۔ وہ الگ موضوع ہے۔

ــــــ (۰) ــــــ

داغوں کی بہار (گذشتہ سے پیوستہ)

★ میں محترم پرویز صاحب (مرحوم) کا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا کہ قرآنِ حکیم کو سمجھ کر پڑھنے کی تحریک ان کے ایک رسالے کو پڑھ کر میرے دل میں پیدا ہوئی۔ اس کے بعد میں نے باقاعدہ ان کے درسِ قرآن میں شرکت کی جب کہ وہ نیپئر بیرکس میں ہر اتوار کی صبح کو دیا کرتے تھے۔ اس کے بعد جب وہ اس کوٹھی میں، جو PECH میں واقع تھی، منتقل ہو گئے۔ میں برابر وہاں بھی حاضری دیتا رہا۔ اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک وہ کراچی میں فروکش رہے۔ اہلِ لاہور کی خوش نصیبی تھی کہ وہ ماہتاب وہاں جا کر طلوع ہوا....

یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ ہر ذی حیات کو ایک نہ ایک دن موت سے ہمکنار ہونا ہے۔ سو پرویز صاحب بھی اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے لیکن انہوں نے اپنے پیچھے جو علم و آگہی کا بے بہا خزانہ چھوڑا ہے وہ کچھ کم نہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس سلسلے کو بہر صورت جاری و ساری رکھا جائے تاکہ اس فیضانِ قرآنی سے کوئی بھی تشنہ لب نہ رہے۔

(محمد عمر۔ قیوم آباد۔ کراچی)

★ پچھلے دنوں کے اخبارات میں پڑھا اور خاص کر میرے ایک دوست کی یہاں جدّہ آمد پر معلوم ہوا کہ جناب غلام احمد پرویز صاحب اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور تمام دوست احباب اور ادارے کو صبرِ جمیل دے۔

(منظر حسین جدہ)

★ محترم پرویز صاحب کی وفات کا غم آسانی سے بھولنے والا نہیں، یہ تو ہمیشہ تازہ رہے گا... دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے درجات کو بلند کرے اور ان کے لواحقین کو صبرِ جمیل دے۔

(عبدالستار، نوشہرہ)

★ ۲۴۔ فروری کا دن ہمارے لئے بے حد سوگوار دن تھا۔ جب علامہ غلام احمد پرویز کی وفات کی خبر سنی، زبان منہ میں بند ہو گئی۔ چند لمحوں کے لئے آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ دم سینے میں رُک گیا۔ اعضاء مفلوج ہو گئے۔ ہمارا حال نہ پوچھو کہ کیا گزری ہم دلِ والوں پہ۔ بس خاموشی اور صبر کے سوا کوئی چارہ نہ تھا انا للہ وانا الیہ راجعون خدا مرحوم کو

غریقِ رحمت کرے۔

(محمد رفیق کھیوںوالی۔گوجرانوالہ)

★ محترم پرویز صاحب رخصت ہو گئے۔ اب ان کی تحریک اور کام کو آگے بڑھانا ہم لوگوں کا کام ہے۔ مجھے قوی توقع ہے کہ احباب و ممبران بزمِ طلوعِ اسلام اس تحریک کو چلانے اور آگے بڑھانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریں گے اور اس کی ترقی کو حرزِ جان بنائیں گے۔

(لطیف الرحمٰن صدیقی، کراچی)

★ مفکرِ قرآن علامہ چوہدری غلام احمد پرویز صاحب ہم سے جدا ہو گئے۔ موجودہ دور میں ان کی جس قدر ضرورت تھی اس کا ملتِ اسلامیہ کو پوری طرح احساس ہے۔ وہ سچے عاشقِ رسولؐ تھے۔ ان کو پیغمبرِ اسلام سے بے پناہ محبت و عقیدت تھی۔ جب بھی نبی اکرمؐ کا نام ان کی زبان پر آتا شدتِ جذبات سے ان کی آواز بھرّا آتی اور آنکھیں نم آلود ہو جاتیں، خدائے تعالیٰ جناب پرویز صاحب کو غریقِ رحمت فرمائے اور ہماری راہ گم کردہ قوم کو ان کی تصانیف سے استفادہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

حافظ محمد یعقوب خان تاجیک ناظم ریسرچ انسٹیٹیوٹ

آف قرآنک لٹریچر و سائنس ۱۔ ریلوے روڈ بھیرہ (ضلع سرگودھا)

★ میں ۲۴ فروری کی گرد آلود شام کبھی نہیں بھول سکتا جب ہمارے عظیم باباجی کی عہد آفریں شخصیت اپنی طبعی زندگی کے آخری لمحات گذار رہی تھی۔ مؤذن نے مغرب کی آذان دی۔ باباجی نے آخری بار میری طرف دیکھا۔ اس وقت ان کی آنکھوں میں کمال کا اطمینان تھا۔ سرگوشی کے انداز میں انہوں نے "اللہ" کہا اور اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی اور اس طرح یہ مردِ مومن۔ علم و عرفاں کے افق پر تابندہ اور درخشاں ستارہ غروب ہو گیا۔

سوگوار۔ سلیم پرویز (باباجی کا بھولا)

★ وقتِ پیری جس کی ہمت تھی جواں
جس کی نظروں میں نہ تھا سود و زیاں
جس نے منزل کا دیا ہم کو نشاں
چل دیا ہے وہ امیرِ کارواں

(میر علاؤالدین صدیقی صاحب جلال پور جٹاں)

★ طلوعِ اسلام میں "داغوں کی بہار" پڑھتی ہوں تو یوں لگتا ہے کہ دنیا کا ہر انسان میری طرح تڑپ رہا ہے۔ ہر لفظ میرے ہی دل کی آواز لگتی ہے۔ آج پتہ چلا کہ آپ کے چاہنے والے کس کس کونے میں ہیں۔ آج جب کہ وہ بھی اپنے آپ کو بے سہارا محسوس کر رہے ہیں تو ان کی آہیں میری آہوں کے ساتھ آسمان تک پہنچ رہی ہیں۔ آپ کے

پیاری پیاری باتیں آپ کی نصیحتیں آپ کا مشکل ترین مسئلہ کو بے حد آسان کر کے سمجھا دینا۔ آپ کی محبت۔ آپ کی شفقت، سب کچھ آپ کے ساتھ ہی چلا گیا۔ اب یہ خلا کبھی پر نہ ہوگا یہ خلا ہی تو ہے جو ہمیں آٹھ آٹھ آنسو رلاتا ہے۔

(سلمیٰ پرویز)

(۱)

وہ امیرِ کاروانِ اہلِ دین
قبلۂ حلقۂ قرآنِ مبین

جس نے چھیڑا دردِ دل کے ساز پر
نغمۂ توحید بین المسلمین

وہ نفیس انداز و درسِ دلنواز
کیا ہوئے؟ کیا کہوں اے ہمنشیں

آ گئے ہیں دل کے آئینے میں وہ
تھم ذرا اے میری چشمانِ حزیں

ہیں بدن میں روح کی صورت مقیم
حشر ساماں وہ قیامت آفریں

خواہشِ تعبیر جب مجروح ہوئی
لے گئے ساتھ اپنے خواب اپنے حسین

ملتِ بیضا کے نباض و حکیم
کہہ گئے قرآن دوائے آخریں

اعترافِ عظمتِ بالانگر
عرشِ نوحہ گر صفِ ماتم زمین

خلیل احمد ساگر
بزمِ طلوعِ اسلام بوریوالہ

---

(۲)

اے بندۂ جلیل، عزائم کے شہسوار!
ہاں اے بساطِ وقت کے رخشندہ شاہکار!
اسلامیانِ دہر میں، یکتائے روزگار!
پروردۂ خلوص، برانگندۂ وقار!
تجھ کو سلام، صاحبِ اعزاز و افتخار

تو نے اٹھائی چہرۂ ظلمات سے نقاب!
تو نے بڑھائی جوہرِ ایماں کی آب و تاب!
تجھ سا کسے نصیب ہوا سچا اضطراب!
ناپید ہے جہانِ عمل میں ترا جواب!
تو گلستانِ دیں کا ہے سرمایۂ بہار

اے حق شعار، خُلق سِیَر، نُطق ترجماں!
تہذیبِ پاک تجھ سے ہوئی قلب آشیاں!
تاریخ بن گئی تری ہستی کی داستاں!
تو دینِ حق کو کر گیا، پائندہ و جواں!
ہے روحِ عصر آج، ترے غم میں سوگوار

(قاسم نور ہ صر)

نوید جانفزا

مطالب الفرقان کی جلد ششم بھی شائع ہو گئی!

اَلحَمدُ لِلّٰہ!

اس میں سورۃ الاعراف کی آیات (۱۵۹ تا ۲۰۶) سورۃ انفال کی کل آیات (۱ تا ۷۵)، سورۃ توبہ کی کل آیات (۱ تا ۱۲۹) سورۃ یونس کی کل آیات (۱ تا ۱۰۹) اور سورۃ ھود کی کل آیات (۱ تا ۱۲۳) آ گئی ہیں، جو بیشتر مشتمل ہیں حضراتِ انبیاء سابقہ کے کوائفِ حیات اور اقوامِ گذشتہ کے نہایت عبرت خیز واقعات پر، جو احباب سلسلۂ مطالبُ الفرقان کا مطالعہ کر چکے ہیں وہ جانتے ہیں کہ تصریفِ آیات کے اصول کے مطابق جس طرح قرآنِ مجید کی تفسیر، ان مجلدات میں پیش کی جا رہی ہیں اس سے قرآنی حقائق کسطرح نکھر کر سامنے آ جاتے ہیں۔

یہ جلد اعلیٰ درجہ کے سفید کاغذ کے (۴۳۶) صفحات پر پھیلی ہوئی ہے
کتابت، طباعت، جلد، سابقہ جلدوں کے معیار کے مطابق، عمدہ اور دلکش۔
قیمت فی جلد -/۷۵ روپے علاوہ محصول ڈاک۔
کتاب کی ترسیل ۱۵ / جون کے بعد شروع ہو گی،

ملنے کا پتہ

۱۔ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵۔ بی گلبرگ ۲ لاہور
۲۔ مکتبہ دین و دانش۔ چوک اردو بازار۔ لاہور

مفکرِ قرآن کے ایک ذاتی معالج کے تاثرات

۲۴ فروری ۱۹۸۵ء شام کے چھ بجے **پرویز صاحب** خالقِ حقیقی سے جا ملے،

شام ساڑھے پانچ بجے تک میں میو ہسپتال میں ان کے کمرے میں موجود تھا، زندگی کی علامت کمرے میں گونجتی ہوئی ایک مسلسل کراہ کی آواز تھی، کارڈیک سرجری کے ایک ڈاکٹر صاحب میڈیکل وارڈ سے ملحقہ اس کمرے میں ان کی گردن میں رگ تلاش کر رہے تھے کہ ٹیکہ دیا جا سکے مگر باوجود مسلسل کوشش کے وہ اس میں کامیاب نہیں ہو پا رہے تھے جی چاہ رہا تھا ان سے کہوں اب جانے دو، اب اور کوشش نہ کرو، اب اس سے کوئی فائدہ نہیں، رگ مل بھی.. گئی تو رگِ حیات میں حیاتِ تازہ دوڑانے کا وقت بیت چکا لگتا ہے —— مگر خاموش رہا —— دراصل جی میرا بھی اندر سے چاہتا تھا، نہ ہو سکنے والی بات ہو جائے، کوئی معجزہ وقوع پذیر ہو، رگ ملے، اس میں زندگی بخش محلول داخل ہو، وہ آنکھیں کھول دیں، دیکھیں تو اردگرد بیٹھے لوگوں میں مجھ پہ بھی نظر پڑے، میں خاموش زبان ہی میں کہہ سکوں، "تم بھی حسرت اٹھو سلام کرو" —— وہ کہیں دیکھا، ڈاکٹر صاحب جو کام خدا کے قانون کے مطابق ہو، ہو کر رہتا ہے، انسان کا کام تو صرف کوشش کرنا ہے اور کوشش کرتے رہنا ہے، قرآن پاک میں ہے کہ اور پھر شمع قرآنی کی لو کی روشنی اندھیروں کا سینہ چاک کرتی ہوئی، دلوں کو نور سے بھرتی چلی جاتی مگر خدا کا قانون کسی انسان کے لئے بھی بدل نہیں سکتا، وہ کہا کرتے تھے خدا کا قانون کسی کی رعایت نہیں کرتا، خدا کے پیغمبر علیہ السلام کے قلب میں بھی یہ خواہش پیدا ہوئی ہوگی کہ خدا سے دعا کی بارِ الہا میں جو تیرے پیغام کو پھیلانے میں اپنی جدوجہد کر رہا ہوں اتنی تکالیف اٹھا رہا ہوں، کیا میں اپنی زندگی میں اپنے مشن کو کامیاب ہوتا دیکھ سکوں گا تو باری تعالیٰ نے فرمایا، آپ کا فریضہ اس پیغام کو پہنچائے چلے جانا ہے، نتیجہ ہمارے ذمے ہے۔

خدا کے قانون کے مطابق ہو چکا فیصلہ نوشتۂ دیوار بن کر نظر آ رہا ہے، در و دیوار اداسی کہے دے رہی تھی کہ تاریکی غالب آنے والی ہے، امید کی کرن بجھنے کو ہے، اس فروزاں شمع کی بجھتی ہوئی کرن کو گل ہوتے دیکھنے کی تاب مجھ میں نہ تھی، بالیں سے اٹھ آیا،

گھر پہنچے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ اپنے بیٹے ڈاکٹر راحیل کا فون آیا:۔

"بابا جی کے گھر سے بول رہا ہوں، ابا، ہم بابا جی کو گھر لے آئے ہیں"

دل نے کہا، بیٹا اب یہ بابا جی کا گھر کہاں اور جس کو تم ۲۵-بی میں لائے ہو وہ بابا جی کہاں ہیں ——"

۲۵۔بی میں جاکر دیکھا تو ایک خاموش جسدِ خاکی تھا، آرام کی نیند سویا ہوا،
دن کے وقت، جب بھی ان کے ہاں گیا، گرمیوں کی تپتی ہوئی دوپہریں یا سردیوں کی، انہیں کام ہی میں مصروف دیکھا، اپنے بڑے سے کمرے میں اپنی بڑی سی کرسی میں آلتی پالتی مارے کچھ نہ کچھ لکھتے ہوئے دیکھا، بڑی سی میز کتابوں اور رسالوں سے اٹی ہوئی،
"باباجی آپ دوپہر کو آرام نہیں کرتے؟"
"نہیں بیٹا، سونا تو شاید میں رات کو بھی نہیں، بس لیٹ جاتا ہوں، رات بھر دوردور تک دیمک کی آوازیں سنتا رہتا ہوں، شاید کسی وقت آنکھ لگ جاتی ہو۔ دل نے کہا کیا اس وقت بھی وہ محض آنکھیں بند کئے لیٹے ہیں یا سچ مچ سوئے ہوئے ہیں۔
عورتوں کے رونے کی آوازوں نے سکوت کو توڑا تو جی میں آئی، کہوں کیوں مخل ہوتی ہو، ابھی تو آنکھ لگی ہے، کچھ دیر تو آرام کی نیند سو لینے دو۔ عمر بھر کے "اُنیندرے" ہیں۔
پنجابی کے ایسے الفاظ کے۔۔۔ تو وہ دل دادہ تھے، کہا کرتے تھے اس نئی نسل کو ایسی پنجابی کہاں آتی ہے، یہ ہم گاؤں والے ہی جانتے ہیں۔
کبھی کبھی باتوں میں یا درس میں فارسی کے شعر آجاتے تو کہتے اس کا ترجمہ بھی کر ہی دوں تو بہتر ہوگا، اگرچہ شعر کا ترجمہ کرنا خوشبو کی تلاش میں پھول کی پتیاں بکھیرنے والی بات ہے — مگر مشکل تو یہ ہے کہ اردو کے شعر کا بھی اب ترجمہ کرنے کی ضرورت پیش آجاتی ہے — اور اصلی پنجابی میں ترجمہ کردوں تو وہ بھی شہریوں کو کم ہی سمجھ میں آئے گا، جذبوں کی جو ترجمانی پنجابی زبان میں ممکن ہے اردو میں کہاں، کبھی کبھی مجھے پنجابی میں وہ بات ملتی ہے جو عربی میں ہے۔ وہی دُور تک پھیلی ہوئی میدان کی وسعت، وہی گہرائی، وہی گھمبیرتا۔
مجھے یاد ہے کچھ عرصہ، سلطان محمود آشفتہ، رؤف شیخ اور ایک اور صاحب (ان کا نام میں بھول گیا) ان کے ہاں آتے رہے، کبھی کبھی شعر و سخن کی محفل بھی رہتی، ان صاحب کی ایک نظم میں، ایک بیوہ ماں کا ذکر ہے جو اپنے کم سن بیٹے کو کوستے ہوئے جو شرارت سے، بقول شاعر کے، اپنے کپڑوں کو کیچڑ میں لبھڑو بھڑو کر آیا ہے، رو دیتی ہے — تو جھوم اٹھے کہ یہ الفاظ پنجابی زبان ہی میں میسر آسکتے ہیں — اور آشفتہ کے حُسنِ بیان کے تو وہ بڑے معترف تھے، ان دنوں آشفتہ شاید نئے نئے سعودی عرب سے آئے تھے۔ ان کی نظموں میں وہ عرب کے صحراؤں کی پہنائیوں میں گونجتی ہوئی آواز کا سراغ ڈھونڈتے تھے —
میں پنجابی لٹریچر سے ایسا واقف نہیں ہوں، ان محفلوں کی یاد رؤف صاحب، آشفتہ صاحب کے دل میں ہوگی —
مجھے تو جب کبھی کوئی شعر، کوئی محاورہ، کوئی لفظ سمجھ میں نہ آتا تو ان کے پاس چلا جاتا — وہ اس لفظ کا ماخذ، محاورے کے لئے معاشرے کا پس منظر، علاقے کے رسم و رواج، وہاں کے

روائت وعقائد، ہر چیز کو یوں بیان کرتے کہ بات عیاں ہو جاتی۔

محاورہ ـــــ یا پنجابی زبان میں جسے اکھوٗن کہتے ہیں، صدیوں کے تجربوں کو کوئی دانشور چند لفظوں میں یوں باندھ دیتا ہے کہ ـــــ اب ان کی زبان کہاں سے لاؤں کہ بات کو بیان کر سکوں، دریا کو کوزے میں بند کرنا ـــــ وُہ کہا کرتے تھے یہ بھی ٹھیک ہوگا مگر وُہ جو پنجابی میں کہتے ہیں، تنت کڈیا ہویا ـــــ اسے میں کیسے سمجھاؤں کہ کیا ہوتا ہے ـــــ چھپی ہوئی حقیقتوں سے پردہ اٹھانا ان پر ختم تھا، ان کا پہلا تعارف ہی مجھے حیران کر گیا، ان کا یہ پہلا تعارف غائبانہ تعارف تھا۔

مذہب کے پابند ماحول میں پلنے بڑھنے کی وجہ سے مذہب سے ایک گونہ لگاؤ تھا مگر زمانے کے تقاضے قدم ڈگمگائے دیتے تھے، دورِ حاضر کی حقیقتیں متزلزل کئے دیتی تھیں۔ بے اندازہ غربت، بے تحاشا امارت، ایک طرف فاقہ مستی دوسری طرف عیش پرستی، ایک طرف بےکسی اور مجبوری، دوسری طرف مطلق العنانی، قوت و جبروت ـــــ اسلامی تاریخ میں ایسی ہی تصویریں نظر آتی تھیں، مسلمان انہیں چھپاتے تھے نہ اس پر شرمندہ تھے۔

شرمندہ تو وہ غلام اور لونڈیوں کے مسئلے پر بھی نہ تھے، اس بیسویں صدی میں بھی مسلمان ممالک ہی ایسے ممالک تھے جہاں انسانوں کی منڈیاں لگتی تھیں اور وہ لوگ جنہیں علماء کہتے تھے اس کا جواز لاتے تھے، اسے درست ثابت کرتے تھے اور دلائل ایسے جن سے ہم غیر مسلموں کو تو کیا مطمئن کرتے، ہمارے اپنے دل مطمئن نہ تھے، اور دل مطمئن نہ ہو تو ایمان کیا ـــــ

[بہت دیر بعد پرویز صاحب ہی سے یہ سمجھا کہ ایمان کا ترجمہ FAITH نہیں، CONVICTION ہوتا ہے۔]

جنگِ عظیم دوم کا زمانہ تھا، ایف اے سی ۴۲ء میں پاس کیا، ابراہیم لنکن کی زندگی پر کتاب (FROM LOG CABIN TO WHITE HOUSE) نصاب میں تھی۔ غلامی کے خلاف اس غیر مسلم کی جدوجہد ذہن پر نقش تھی جس نے اسے ہماری نگاہ میں ہیرو بنا رکھا تھا ـــــ اور اِدھر یہ صورتِ حال تھی، غلام اور لونڈی کا جواز اور بنیادی انسانی حقوق اتنا بڑا انتضاد تھا کہ ان علماء کے دلائل کے باوجود سلجھائے نہ سلجھتا تھا ـــــ اور اسی طرح دولت کی غیر منصفانہ تقسیم اور انصاف بے یقینی کی خلش بن کر بے چین کئے دیتی تھی ـــــ کہ ایک جگہ ایک کتاب نظر پڑی، مذہبی مسائل پر کتاب تھی، سوچا کوئی نئے عالم ہوں گے، چلیں دیکھتے ہیں ـــــ بس یونہی پڑھنے کے شوق نے صفحے الٹنے پر مجبور کر دیا ـــــ فہرستِ مضامین دیکھی تو ایک عنوان غلام اور لونڈیاں ملا ـــــ سب سے پہلے اسی جگہ سے کتاب کھولی، پڑھا تو محسوس ہوا کہ جیسے نگاہ پر پڑے ہوئے پردے یکایک ہٹ گئے ہیں، تاریکیاں چھٹ گئیں ـــــ اور جو کچھ میں نے اس میں پڑھا اس نے مجھے اتنی ہمت دی کہ میں

اس کے بعد کسی بھی غیر مسلم کو سر اٹھا کر کہہ سکتا تھا کہ اسلام میں سب انسانوں کو برابر کے حقوق حاصل ہیں، جنگی قیدیوں کو غلام اور لونڈی بنا کر رکھنے کا حکم قرآن پاک میں کہیں نہیں، سارے کلام پاک میں جنگی قیدیوں کے متعلق ایک ہی آیت ہے اور وہ یہ کہ انہیں فدیہ لے کر چھوڑ دو یا احسان رکھ کر ___

یہ کتاب تھی قرآنی فیصلے اور یہ میرا ان سے پہلا تعارف تھا جس نے میرے ذہن کی ایسی گرہ کھول دی تھی جو مجھے مذہب ہی سے برگشتہ کئے دیتی تھی۔

۱۹۶۰ء میں ہم لوگوں نے گلبرگ میں رہائش اختیار کی تو اتفاق کہئے مکان ملا تو ۱۲۱۔ ڈی جو ۲۵۔ بی کے عین سامنے تھا، درمیان میں سڑک پار اب ایک مکان بن چکا ہے اس زمانے میں نہیں تھا، ہم لوگ اپنے گھر کے برآمدے یا بالکونی سے دیکھا کرتے تھے کہ ۲۵۔ بی میں اتوار کو شامیانے لگتے ہیں لوگ آتے ہیں، کوئی محفل، کوئی مجلس، کوئی جلسہ ہوتا ہے مگر دوسرے عام دنوں میں کوئی غیر معمولی بات نہ ہوتی تھی، کبھی کبھار ایک چھوٹی سی کار، آسٹن جسے بے بی آسٹن کہتے تھے اس گھر سے بچوں کو لے کر نکلتی تھی اور کبھی کبھی عینک لگائے، ٹوپی اچکن پہنے کوئی بزرگ بھی ان کے ہمراہ ہوتا تھا،

اتوار کو کلینک کا ناغہ ہوتا تھا، سوچا چل کر دیکھیں، گئے تو پتہ چلا یہی پرویز صاحب ہیں، اور یہ طلوعِ اسلام کا دفتر ہے، اور ہر اتوار کی صبح قرآن کریم کا درس ہوتا ہے۔

چند اتواروں کے بعد سارا ہفتہ اتوار کا انتظار رہتا کہ قرآن پاک کی چند آیتوں کی ایسی دلنواز تشریح اور مفہوم سننے میں آتا، کہ ایمان پختہ سے پختہ تر ہوتا گیا کہ انسانیت کی نجات اسی پیغام میں ہے، انہی محفلوں میں سمجھ میں آیا کہ اقبالؒ نے کیوں کہا تھا۔

ع گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

یہیں سمجھ آیا کہ چند عقائد رکھنے، کچھ عبادات بجا لانے ہی کا نام اسلام نہیں ہے، یہ شہادت گہہ الفت میں قدم رکھنا ہے ___ اس کے لئے پہلے ہر طاغوت سے کفر (انکار) کرنا ہوتا ہے، ہر بت کو دل سے نکالنا ہوتا ہے پھر ایمان کی سٹیج آتی ہے اور ایمان کو قائم رکھنا عمر بھر طاغوت سے انکار اور طاغوتی طاقتوں کے خلاف مسلسل جہد کا نام ہے ___ لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا!

خدا کے قوانین کے علاوہ اور قوانین کی اطاعت کفر ہے اور خدا کے قوانین کے ساتھ ساتھ دوسرے اور قوانین کی اطاعت شرک ___ شرک سے زندگی میں فساد پھیلتا ہے، خارجی کائنات کا نظام ایک ہی خدا کے قوانین کے تابع ہے اسی لئے اس حسن و خوبی سے چل رہا ہے اگر انسان بھی اپنا سارا نظام قوانینِ الٰہی کے تابع کر لے تو سب فسادات ختم ہو جائیں، ہر طرف

حسن ہی حسن ہو۔

یہیں سے معلوم ہوا کہ قرآنِ پاک کی زبان عربیٔ مبین کا ترجمہ ممکن ہی نہیں، اس کا مفہوم تو بیان ہو سکتا ہے ترجمہ نہیں، یہ زبان اس قدر فصیح و بلیغ ہے کہ اس کا بدل نہیں ہو سکتا، قرآن پاک میں اللہ تعالےٰ نے جو لفظ استعمال کیا وہ اپنی جگہ ہمالہ سے بھی زیادہ مستحکم اور غیر متبدل ہے، اس کی جگہ کسی اور زبان کا لفظ تو کیا عربی کا بھی کوئی دوسرا لفظ استعمال نہیں ہو سکتا۔ ہمسایہ ہونے کی وجہ سے باقاعدگی سے جاتے رہنے کی وجہ سے یا کبھی کبھار شاید اپنے پیشے کی وجہ سے روابط بڑھے، خوش فہمی کا اظہار کروں تو کہوں کہ شاید میری طبیعت کے ادبی ذوق کو بھی اس میں دخل تھا کہ وہ میرا وقت بے وقت آنا جانا برداشت کرتے رہے، خوش فہمی میں اور بھی بڑھوں تو کہوں کہ جب قائد اعظمؒ کو ملنے کے لئے کوئی شخص اگر وقت مقرر کئے بغیر ملنے جا سکتا تھا تو وہ پرویز صاحب تھے، اسی طرح پرویز صاحب کو بغیر وقت مقرر کئے مجھے ملنے کی اجازت تھی، کم از کم انہوں نے مجھے کبھی یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ میرا جانا انہیں ناگوار گزرا ہو، کچھ ہی ماہ پہلے میں ایک شام گیا تو اندر کوئی صاحب بیٹھے ہوئے تھے ان کے پلنگ کے قریب کرسی پر بیٹھے ان سے گفتگو کر رہے تھے، ان دنوں بھی ان کی طبیعت اچھی نہ تھی، میں کمرے میں داخل ہوا تو حسب معمول مسکرا کر بیٹھنے کو کہا؛

میں کہ حدِ ادب کی وجہ سے ہمیشہ فاصلے پر بیٹھتا تھا۔ یہ دیکھ کر کہ مہمان میرے آنے پر اور قریب ہو گیا، میں کچھ اور دُور ہو بیٹھا —— وہ صاحب اٹھ کر چلے گئے، کوئی ذکر نہیں ہوا اس بات کا، بعد میں ایک دن پتہ چلا کہ محمود ہارون صاحب تھے؛ ——

اپنی طبیعت میں ادبی دخل کا ذکر میں نے اس لئے کیا کہ میں نے دیکھا کہ قرآن پاک کا یہ معلم کوئی زاہدِ خشک نہیں، نہ کبھی انہیں مخالفتوں میں کف بر دہاں دیکھا نہ ماتھے پر جبر کی لکیریں نظر آئیں، مجھ سے کم علم کو بھی کبھی اپنی کم مائیگی کا احساس نہیں ہونے دیا —— گفتگو ہمیشہ سلجھی ہوئی مگر شگفتہ ہوتی تھی، شعر کا اتنا اچھا ذوق تھا کہ باید و شاید —— فارسی اور اردو کے اتنے برمحل شعر ان کی گفتگو میں سجے دیکھے کہ اور کسی کی بات میں کم ہی سننے کو ملیں گے —— اور یہ راز تو بہت بعد میں جا کر کھلا کہ موسیقی کا اتنا گہرا علم اور ذوق تھا کہ بڑے بڑے استادوں کو بھی کم ہی ہو گا —— ان کی محفل میں بیٹھنے کے اور مواقع میسر ہوئے تو اور کئی راز کھلے، مثلاً یہ کہ تلاشِ حق کا یہ متلاشی کن کن سنگلاخ وادیوں سے گزر کر اس خیابان تک پہنچا تھا۔ کیسی کیسی خار دار وادیوں میں اسے مدتوں بھٹکنا پڑا —— کیسے کیسے مراقبے، کیسے کیسے چلے کاٹے، کیسے کیسے وظائف کئے، کیسی جانگداز مشقتیں برداشت کیں، کہاں کہاں صحت اور اعصاب کو آزمایا —— کن کن بھول بھلیوں میں شب و روز گنوائے مگر جب قرآنِ پاک

سے رہنمائی پائی، اس سراجِ منیر کی روشنی میں چیزوں کو دیکھا تو باقی سب کچھ ہیچ نظر آیا۔

کاش مجھے اتنی فرصت ہوتی کہ زیادہ وقت ان کی محفل میں بیٹھ سکتا یا اتنی توفیق ہوتی کہ ان تمام باتوں کو تحریر کے احاطے میں لاکر محفوظ کرسکتا۔

اب تو اک یاد سی باقی ہے سو وہ بھی کیا ہے

مزے کی بات یہ تھی کہ جب وہ یہ سب باتیں بیان کر رہے ہوتے تو کسی بڑائی کے احساس سے نہیں، میں نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ وہ کسی بلند پایہ واعظ کی طرح خود کو کسی اونچے مقام پر تصور کرکے بات کرتے تھے بس یونہی جیسے وہ ہم ہی میں سے، ہم ہی کی طرح ہوں، یہ قصے وہ ایسے سناتے جیسے منزل پہ پہنچ کر کوئی صحرا نورد اپنے پاؤں کے آبلوں کا شمار کرے اپنے تلووں میں چبھے کانٹوں کی داستان بیان کر رہا ہو، دوسروں پر رعب ڈالنے کے لئے نہیں، صرف یہ بتانے کے لئے کہ لو میں نے تمہارے راستے کے اتنے کانٹے اپنے پاؤں میں سمیٹ کر تمہارے لئے یہ راہ اتنی سہل بنادی ہے ـــــ بعد میں آنے والا کوئی راہی گھبرائے تو سرخیٔ خار مغیلاں اسے یہ ڈھارس دے کہ کوئی صحرا نورد پہلے بھی اس راہ پر آچکا ہے،

ع سرخیٔ راہ مغیلاں یہ پتہ دیتی ہے،

تیرے دیوانے ادھر آئے یہاں تک پہنچے

خود تو اپنی گفتگو کو اچھے شعروں سے مزین کرتے ہی تھے کوئی اور بھی اچھا شعر سنائے تو اسے پسند کرتے تھے، مگر بات شعروں تک محدود کہاں تھی۔ محاورے، روزمرہ کی مثالیں اور شگفتہ لطیفے۔

اب تو بہت سالوں سے یہ روایت نہ رہی شروع کے سالوں میں ہر سال ایک کنونشن ہوا کرتی تھی جس میں علمی مقالے تو خیر ہوا ہی کرتے تھے ایک دلچسپ سیشن سوال و جواب کا بھی ہوا کرتا تھا، مجلسِ استفسارات اس میں اکثر جوابات کے ساتھ لطیفوں کی چاشنی ہوا کرتی تھی، اپنے ایک عزیز محض لطیفے سننے کے لئے یہ سیشن ضرور سنا کرتے تھے، خدا جانے انہیں کیا ادا بھائی کہ طلوعِ اسلام کا مطالعہ شروع کر دیا، پھر ان کی کتابیں پڑھنے لگے، پھر درس میں آنے لگے اور آج ایک غیر ملک میں درس کا اہتمام کرتے ہیں،

پرویز صاحب نے قرآن کو کیسے سمجھا یہ الگ داستان ہے' انہوں نے قرآن کیسے سمجھایا یہ ان کے دلوں پر نقش ہے جنہوں نے ان کے وہ درس سنے ہیں جو ہر ہفتہ مقررہ اوقات پر ۲۵ بی گلبرگ میں ہوا کرتے تھے ـــــ اس کے علاوہ قومی اور ملی زندگی میں ان کا کیا حصہ تھا اس کا مجھے کچھ کچھ علم تو ہے مگر اس پر بہتر روشنی ان کے وہ رفیق ڈال سکتے ہیں جو دِلّی اور شملے میں ان کے ساتھ تھے جہاں ان دنوں کی سیاست گھومتی تھی' ـــــ قائداعظمؒ کے ساتھ ان کے روابط کیسے تھے، علامہ اقبالؒ سے ان کی عقیدت کیسی تھی کہ حیاتِ اقبالؒ میں

جو پہلا اور آخری یوم اقبالؒ منایا گیا اس میں سید نذیر نیازی مرحوم نے دلی کے ایک قافلے کا ذکر کیا ہے۔ اس میں ایک نمایاں نام پرویز صاحب کا بھی ہے ———

قیام پاکستان میں ان کے ذمے ایک محاذ تھا، یہ ایک چو مکھی لڑائی تھی، ہندو کے خلاف، انگریز کے خلاف اور کچھ اپنوں کے خلاف، قانونی اور دستوری محاذ، سیاسی محاذ تو قائداعظمؒ نے سنبھال ہی رکھے تھے اور وہ تنہا اتنی عظیم شخصیت تھے کہ ہر مخالف ایوان ان کی ذہانت و فطانت، قانونی مہارت، کردار کی بلندی، دیانتداری اور اخلاقیات سے وابستگی کی بنا پر لرزہ براندام تھا ——— مگر جو اپنوں کا محاذ تھا ان میں ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو جبّہ و دستار کے حامل لوگوں پر مشتمل تھا، یہ لوگ سجادہ نشین و خرقہ پوش نہ بھی تھے تو مریدوں نے ان کے گرد تقدس کے ہالے بُن رکھے تھے۔ یہ طبقہ خدا اور اس کے رسول پاک کا نام لے کر قیام پاکستان کی مخالفت کرتا تھا، کیوں کرتا تھا، میں اس بحث میں نہیں پڑوں گا کہ اس وقت میرا یہ موضوع نہیں مگر یہ حقیقت ہے کہ بہت سے نامی گرامی علمائے کرام نے اس کے قیام کی مخالفت کی۔ یہ محاذ طلوع اسلام نے سنبھال رکھا تھا ——— پرویز صاحب نے اپنے مضامین میں واضح کیا کہ قیام پاکستان صرف ہندو کی تنگ نظری کی وجہ سے ناگزیر نہیں، اقتصادی مفادات بھی اس کی بنیادی وجہ نہیں، یہ ہمارے دین کا تقاضا ہے۔ اسلام صرف مذہبی عبادات و رسوم کو بجا لانے کا نام نہیں، یہ ایک نظام زندگی ہے اور نظام آپ نافذ کر ہی نہیں سکتے۔ جب تک آپ کے پاس ایک خطۂ زمین نہ ہو، ایک بار ایک مختصر سا خطہ زمین ہی سہی، مل جائے جس میں قرآن پاک کا دیا ہوا عدل و احسان پر مبنی نظام نافذ اور معاشرہ قائم کر دیا جائے تو یہ فردوس گم گشتہ کی طرف انسانیت کے سفر کی ابتداء ہو سکتی ہے ——— اور بقول ایک چینی کہاوت کے، دنیا کا طویل ترین سفر بھی اس وقت سمٹنا شروع ہو جاتا ہے جب اس کی طرف پہلا قدم اٹھا لیا جائے ——— اور قیام پاکستان ہمارا پہلا قدم تھا ——— اور اسلام کے انقلابی تصور سے ہنود و یہود ہی نہیں، نصرانی اور دہریے ہی نہیں، جاگیردار اور سرمایہ دار اور استحصالی طبقات ہی نہیں انکے حلیف ملائیت کے علمبردار بھی خائف تھے کہ اس کی آمد سے قیصر و کسریٰ کے محلات ہی نہیں، سبھی مفاد پرستوں کے بت ٹوٹتے تھے ———

مخالف ہوائیں تند و تیز رہیں، وسائل کم تھے پھر بھی وہ مرد درویش اپنا دیا جلائے رہا، انہیں معلوم تھا کہ ان کی آواز یکہ و تنہا ہے، یہ عقل و خرد کی، یہ سوچ کی، یہ غور و فکر کی، یہ تدبّر و تفکّر کی آواز ہے، یہ RATIONAL REASONING[1] کی طرف دعوت ہے۔

انگریزی کا یہ لفظ استعمال کرنے کی معذرت چاہتا ہوں اس کا متبادل مجھے سوجھ نہیں رہا اور

---

[1] معقول استدلال

جس سے میں پوچھ سکتا تھا، جس سے میں اکثر ایسی باتیں پوچھتا تھا وہ آج خاموش ہے، اسطرح خاموش ہے جیسے عمر بھر کی بے قراری کو آج قرار آگیا ہو، اسے بے آرام کرنے کو جی نہیں چاہ رہا کہ پوچھ سکوں۔ اَعِظُکُمْ بِوَاحِدَۃٍ کے بعد ایک لفظ تَتَفَکَّرُوْا میں کیا کچھ پنہاں ہے، اس پہ تو ذرا روشنی ڈال دیجئے ــــــ!

آخری درس اکتوبر ۱۹۸۴ء کے پہلے ہفتہ میں ہوا، اس میں انہوں نے اداس سے لہجے اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور یہ بات اب وہ اکثر کہنے لگے تھے کہ عزیزانِ من زندگی کا کیا بھروسہ، خدا جانے یہ موقعہ پھر ملے نہ ملے، چاہتا ہوں کہ بیان کر جاؤں، اگلے درس میں ثواب کا ذکر آ رہا ہے، وہاں بتاؤں گا ثواب کیا ہوتا ہے ــــــ مگر وہ اگلا درس نہ آسکا، اور بات تشنہ ہی رہی۔ اگلے درس سے پہلے ہی ایک صبح فون آیا کہ کلینک سے پہلے میری طرف ہوتے جائیے، رات بھر سو نہیں سکا، بڑی تکلیف رہی، معلوم ہوا ٹانگ میں درد ہے، ــــــ اور وجہ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں ایسی تبدیلی تھی جو اس عمر میں اکثر ہو جاتی ہے، اپنی طرف سے مناسب دوا تجویز کر دی ــــــ دو دن کے بعد معلوم ہوا تکلیف کم نہیں ہو رہی بلکہ بڑھ رہی ہے، محترم ڈاکٹر ودود صاحب آئے انہوں نے کچھ انجکشن تجویز کر دیئے، وہ بھی لگائے مگر بات وہیں کی وہیں تھی، ان کی مزید تجویز پر عمل کرنے سے پہلے میں نے مناسب جانا کہ کسی آرتھوپیڈک سرجن سے مشورہ کیا جائے، وہ بھی کیا مگر افاقے کی صورت نظر نہ آئی بلکہ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔

پنڈی میں سی ایم ایچ میں متعین نیورو سرجن بریگیڈیئر نثار صاحب پر انہیں بہت اعتماد تھا، جن دنوں وہ لاہور میں ہوا کرتے تھے، اکثر درس میں آیا کرتے تھے، انہیں پیغام بھجوایا انہوں نے کچھ دن بعد آنے کا وعدہ کیا اور درمیانی عرصے کے لئے لاہور سی ایم ایچ کے ایک سرجن کو بھجوایا، انہوں نے دیکھا، اپنے ہسپتال لے جا کر مزید ایکسرے لئے اور ریڑھ کی ہڈی میں ایک ٹیکہ لگوایا صرف ایک رات افاقہ رہا حالانکہ اس ٹیکے کا اثر کم از کم دو ہفتے رہنا چاہیئے تھا، خیر تیسرے دن پھر بھی ٹیکہ لگایا مگر افاقہ نہ ہوا۔

راحیل بیٹے کا اصرار تھا کہ (SCAN) ہونا چاہیئے (MYCLOGRAPHY) ہونی چاہیئے تاکہ تشخیص مکمل ہو مگر شاید اس کی کم عمری اس کی رائے کے وزن کو ہلکا کر دیتی تھی ــــــ اور تو اور میں بھی اس پہ زور نہ دیتا۔

خدا خدا کر کے بریگیڈیئر صاحب آئے، پنڈی سے چلے تو خیال تھا کہ تین دن ان کی توجہ ملے گی مگر ؎

ایک ہی بار ہوئیں وجہ گرفتاریٔ دل
التفات انکی نگاہوں نے دوبارہ نہ کیا

انہوں نے دیکھا کر یہ نرو (NERVE) کا مسئلہ ہی نہیں، کولہے کی ہڈی میں تکلیف ہے، ایک انجکشن دیا اور چلے گئے کہ بس مسئلہ حل ——— مگر جب ان کے جانے کے بعد بھی حالت میں کچھ تبدیلی نہ ہوئی، دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں، والی کیفیت تھی۔ ڈاکٹر بیٹا مصر تھا کہ یہ ڈسک کا مسئلہ ہے، نرو پہ پریشر ہے، یہاں کے نیورو سرجن کو دکھالو، بریگیڈیر صاحب بار بار کیسے آئیں گے یا انہیں پنڈی لے چلو جو ممکن نہ تھا۔ اس کام کے لیئے نیورو سرجن ڈاکٹر بشیر صاحب سے بہتر کون ہو سکتا تھا۔ لیکن میرا ڈاکٹر صاحب سے ذاتی رابطہ نہ تھا مگر مریض کی بہتری کے لیئے کچھ کرنا لازمی تھا، ڈاکٹر اکرم مرزا (گجرات والے) اور ڈاکٹر صادق ملہی (میاں چنوں والے) درمیان میں آئے، ملہی صاحب غالباً ڈاکٹر بشیر کے کلاس فیلو بھی ہیں بے تکلفی بھی ہے، انھوں نے کہا کہ بھئی تم عجیب آدمی ہو، لاہور میں ایک اتنی بڑی شخصیت اس حال میں ہے اور تم کچھ کہہ ہی نہیں رہے، بشیر صاحب نے کہا بھلے مانس مجھے کسی نے بتایا ہوتا تو میں کچھ کرتا، مجھے تو خبر ہی نہیں، ——— اب تم نے کہا ہے تو لو میں جاتا ہوں ——— چنانچہ ڈاکٹر صاحب خود ۲۵-بی گلبرگ آئے مریض کو بغور دیکھا، تمام کاغذات دیکھے، تفصیلی گفتگو کی، ہماری، ہم سب کی امیدوں اور توقعات سے بڑھ کر وقت دیا، دلچسپی لی اور مشورہ دیا کہ کل صبح میں خود ان کا (MYELOGRAPHY اور SCAN) کردوں گا، صبح ہسپتال کی ایمبولنس آئے گی جو بہت آرام سے مریض کو ہسپتال پہنچائے گی باقی میرا ذمہ، میں یہ کام سب سے پہلے کردوں گا ———

ان کا رویہ حیرت انگیز حد تک انسان دوستی کا تھا، حالانکہ ہمارے فکر اور حلقے سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا، طب کے پیشے کی بلند تر روایت کا عملی مظہر ہماری آنکھوں کے سامنے تھا۔

۸۲ سال کی عمر، ۲۰ درجہ کی حرارت والے کمرے میں مسلسل کئی گھنٹے کا ٹسٹ، کتنی ہی احتیاط سے کیوں نہ ہو، اپنا اثر دکھا گیا، واپسی کے وقت سخت درد تھی۔ آتے آتے درد کو کم کرنے کے لیئے درد بند کرنے والا ایک انجکشن بھی ہسپتال میں لگایا گیا۔

دوپہر تین بجے کھانا کھا کر فارغ ہوا ہی تھا کہ ڈاکٹر راحیل کا، کہ سارا وقت ان کے ہمراہ تھا، کا فون آیا کہ آپ جلدی سے آجایئے ——— ! میں نے کہا خیر تو ہے، ہاں خیر ہے مگر بابا جی کچھ گھبرائے ہوئے ہیں، آپ کے آنے سے انہیں تسلی ہو جائے گی، آپ آکر انہیں تسلی دیں ———

میرا ماتھا ٹھنکا، جلدی بلانا بے وجہ نہ تھا ——— پہنچا تو دیکھا کہ رنگ اڑا ہوا تھا، چہرے پر ہوائیاں، سخت بے چین، ہاتھ لگایا تو پسینے میں تر بہ تر جسم یخ ٹھنڈا، سخت قسم کے شاک کی سی حالت ——— اس انجکشن کے متعلق پہلے بھی میرا تجربہ کچھ اچھا نہ تھا، سوچا اسی کے کارن ہے، اسی وقت ایک اینٹی الرجک انجکشن دیا، ڈرپ منگوائی گلوکوز کی اور ڈاکٹر بشیر کو فون کیا۔

کچھ ہی دیر میں ڈاکٹر صاحب آگئے، ڈرپ سٹارٹ ہو چکی تھی، اپنے ہاتھ سے انھوں نے اس میں مزید انجکشن (DECADRON) شامل کیا، بڑی دیر تک پاس بیٹھے دیکھتے رہے، تسلی دیتے رہے،

یہ وقت ان کی شام کی پریکٹس کا تھا اور جو لوگ واقف ہیں جانتے ہیں ان کا یہ وقت کس قدر مصروف اور قیمتی ہے مگر ان کو یوں پاس بیٹھے بے تکلفی سے باتیں کرتے ہوئے دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ انہیں اگر کوئی مصروفیت تھی تو صرف ایک اسی مریض کی خبر گیری کی ——— اور وہ اس وقت تک ان کے قریب بیٹھے رہے جب تک کہ ان کی اپنی تسلی نہیں ہو گئی کہ اب خطرے والی کوئی بات نہیں، گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد جب وہ گئے بھی تو یہ ہدایات دے کر کہ انہیں گھنٹے گھنٹے بعد اطلاع دی جائے، اور رات بارہ بجے تک میں ان کو نبض کی رفتار، ٹمپریچر، بلڈ پریشر کے متعلق اطلاع دیتا رہا ——— بارہ بجے میں نے کہا اب حالت بہتر ہے اب آپ کو صبح ہی بتانا ہوگا، جواب ملا کیوں، ضرورت ہو تو مجھے بتاتے رہیں۔ بلکہ ہر گھنٹے مجھے بتاتے رہیں، فون میرے سرہانے ہوگا، بارہ بجے کے بعد ڈیوٹی ڈاکٹر راحیل نے سنبھال لی تھی اور اس نے مجھے صبح بتایا کہ رات اس نے جب بھی فون کیا ڈاکٹر صاحب نے فوری اٹھایا اور بات سن کر اس کا جواب دیا ———

فرض شناسی کی ایسی مثالیں اس دور میں کہاں سے لائیں گے ہم، ایسے لوگوں کی موجودگی غنیمت ہے۔

آپریشن کے بعد مسلسل نگہداشت کے کمرے میں انہیں دیکھا، پراگریس بڑی اچھی تھی، جلد ہوش میں آ گئے، جلد ہی مسلسل گلوکوز کی ڈرپ سے چھٹکارا ملا، کچھ کھانے کی اجازت بھی مل گئی، نحہ دو لمحہ ملنے کی اجازت بھی ہو گئی، بات چیت بھی کرنے لگے گو دھیمی آواز میں،

ایک رات میں مسلسل نگہداشت کے کمرے میں ان کے پاس تھا، چھت کی طرف دیکھ کر کہنے لگے ——— دیکھ رہے ہیں آپ کیسی کیسی بھیانک شکلیں بنتی ہیں اس چھت میں ——— (FALSE CEILING) میں جو میٹریل استعمال ہوا تھا اس میں کچھ ڈیزائن واقعی ایسے تھے کہ میں نے غور کیا تو کہیں کوئی بے سر دھڑ نظر آ رہا تھا، کہیں کچھ کہیں کچھ، تھا تو یہ سب تصور ہی جیسے بادلوں میں شکلیں بنتی بگڑتی دکھائی دیتی ہیں۔ کہنے لگے نیند تو آتی نہیں، اور آنکھیں کھول کر چھت کو دیکھوں تو یہ کچھ؟ میں نے کہا ٹھیک ہے جی یہ سائنسی لوگ ہیں، انہیں ان تصورات سے کیا، یہ چاند تک خلائی راکٹ میں جانا تو سوچ سکتے ہیں مگر یہ تصور ان کے بس کی بات نہیں کہ سوچ سکیں، محسوس کر سکیں۔

رات باقی تھی ابھی جب سرِ بالیں آ کر
چاند نے مجھ سے کہا جاگ، سحر آئی ہے

جاگ اِس شب ———

شاعروں کو کوئی صلاح کار بھی نہیں رکھنا ورنہ وہ انہیں سمجھاتے کہ اس جھوٹی چھت کو ہلکا سا نیلا رنگ ہی دے دیتے کہ کوئی نیم خوابیدہ مریض خود کو کھلے آسمان کے نیچے سویا ہوا ہی سمجھ لیتا اور اس جھوٹی نیلی چھت میں چاند ستارے بھی تو بنائے جا سکتے تھے کہ جیسے نیند نہ آئے، اختر شماری کا مشغلہ

ہی آزماتا۔

"تاروں کا گو شمار میں آنا محال ہے
لیکن کسی کو نیند نہ آئے تو کیا کرے"

مُسکرا دیئے، خاموش ہو گئے۔ کئی بار میں نے سوچا کہ ایسی بات کہہ کر شاید گستاخی کر رہا ہوں مگر ان کے روّیے نے کبھی میری دل شکنی نہ کی۔ ابھی میری ان کی شناسائی ابتدائی مرحلوں میں تھی کہ یہ جتانے کے لئے کہ میں بھی صاحب قلم ہوں اپنی پہلی اور اس وقت تک تنہا تصنیف، اپنا پہلا ناول انہیں پیش کرنے کی ٹھان لی، ان کے بلند مقام کا احساس مجھے اس وقت بھی تھا، پیش کرنے کو کر دیا مگر اس جسارت پہ جو شرمندگی ہو رہی تھی اسے دور کرنے کے لئے لکھا ——— اس شرمندگی کے ساتھ کہ کسے کیا پیش کر رہا ہوں ——— مگر اِدھر سے ایک مسکراہٹ کے ساتھ جواب ملا،

بر آور ہر چہ اندر سینہ داری
سرودے، نالہ اے، آہے فغانے

مگر اختر شماری تو ایک طرف جلد ہی وہاں ایک اور مسئلہ پیدا ہو گیا اور وہ تھا ایک ہمسایہ مریض جو مدت پہلے دماغ کے آپریشن کے مرحلے سے گزر چکا تھا اور اب ہمہ وقت بے ربط وبے ہنگم باتیں کرتا تھا، مسلسل، متواتر بے ربط بے ہنگم بلند آواز۔ ———
کہنے لگے۔ "مجھے یہ سزا کیوں دے رہے ہو، ڈاکٹر صاحب مجھے اس کمرے سے نکلوا لیں"

میں نے کہا، بابا جی صبح ڈاکٹر صاحب سے کہہ کر اجازت لے لیں گے" کہنے لگے صبح ہو گی تو اجازت لو گے نا ——— ارے بابا میں کہتا ہوں صبح کیسے ہو گی، میں رات یہاں نہیں کاٹ سکوں گا، صبح تک ایسے نہیں جی سکتا۔"

ہاں ان کے جینے کا اپنا ایک انداز تھا، اپنا منفرد، مخصوص ——— منفرد اور مخصوص ہی نہیں ایک البیلا اور اگر آپ اجازت دیں تو کہوں فنکارانہ ——— فنکارانہ اور پھر بھی درویشانہ،

چائے نفیس ترین پیتے تھے، کبھی کبھی محفل میں جب ہم تک بھی آیا دَورِ جام تو مدتوں زبان پہ اسکا ذائقہ رہا، شہد ان کے پاس اصلی ہوتا تھا، پھل جب کھاتے تھے تو نفیس، بے داغ، پکا ہوا، لذیذ ——— پھلکا کھاتے تھے تو سیح پج کا پھلکا جس کے دو پرت علیحدہ علیحدہ ہو سکیں، زیادہ نہیں کھاتے تھے مگر وقت پر، صاف ستھرا ——— اور بے وقت کچھ بھی نہیں کھاتے تھے۔ چاہے ان کی کتنی ہی مرغوب شے کیوں نہ ہو۔

سردی انہیں بہت لگتی تھی، شاید ہر وقت بیٹھے رہنے کی وجہ سے خون کی معمول کی گردش جسم کو گرمانے سے معذور تھی اس لئے سردیوں میں کپڑے بہت سے پہنتے تھے۔ پوری آستینوں کی بنیان لمبا زیر جامہ، گرم کپڑے کی قمیص یا جامہ یا شلوار، اوپر سویٹر، سویٹر پہ دوا سکٹ، اچکن، مفلر اور گرم ٹوپی اور اس کے اوپر کبھی کبھی دھسّہ،

لو والی گرمی بہت راس تھی، مرطوب موسم سے تو گویا انہیں الرجی تھی، مطلع ابر آلود ہوا اور انہیں صحت کی تشویش لاحق، اب بلغم تنگ کرے گی، یا سرد، گرم، بلغمی، صفراوی وغیرہ طب و حکمت کی باتیں ہیں مگر ان کی باتوں سے محسوس ہوا کہ انہیں شاید حکمت سے بھی کچھ مس تھا۔ موسم ہی کی وجہ سے شاید وہ کراچی سے لاہور نقل مکانی پر مجبور ہوئے۔

بار ہا جی میں آئی، کئی دفعہ کہا بھی، چھوڑیئے باباجی، اندھوں کے آگے رونا اپنے ہی نین کھونا اس سب سے کیا حاصل، آپ کو یہ سب کرتے ہوئے آدھی صدی ہو گئی، وہی گنے چنے لوگ ہیں، درسوں میں بھی وہی چہرے نظر آتے ہیں کچھ نئے آتے ہیں تو کچھ پرانے غائب ہوتے ہیں ——— جواب ملتا ہمارے ذمے تو کہے چلے جانا ہے۔ کوشش ہی ہماری ذمہ داری ہے ———

میں کہتا کیوں نہ کسی دوسرے ملک میں جا کر آپ اسے آگے بڑھاتے۔ جہاں لوگ اسے کھلے دل سے قبول کرنے کو تیار ہوں، نئی بات کو سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں، اسے اپنانے کی ہمت کر سکتے ہوں، یہاں تو لوگ پہلے سے پختہ عقیدے لے کر آتے ہیں اور پھر بس اس کی تائید کی خواہش لے کر آتے ہیں، اپنی سوچ سے مختلف کسی بات کو قبول کرنے کا ذہن لے کر نہیں آتے ———

اس پیغام کو آپ کسی مغربی معاشرے تک ہی پہنچائیں جہاں لوگ بہت خوشحال ہیں، بہت آزاد ہیں مگر پھر بھی بہت پریشان ہیں۔ مادیت کے ہاتھوں تنگ آئے ہوئے لوگ یوگا اور ویدانت ہی نہیں لگا نجا اور ہیروئن تک میں پناہ ڈھونڈ رہے ہیں ——— مغربی جرمنی خوشحالی سے بے حال ہو رہا ہے۔ ناروے، سویڈن، سکینڈینیوئن ممالک اوپن فری سوسائٹی ہے، اخلاقیات سے بے نیاز، گھر کے تصور تک سے نا آشنا ہو رہے ہیں ——— مگر سوچنے والے ذہن ہر جگہ سوچتے ہیں، اپنی موجودہ حالت سے بیزار نالاں ہیں، راستہ ڈھونڈتے ہیں مگر انہیں راستہ نہیں ملتا، روایتی مذہب کو وہ بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں، وحی کی روشنی جو قرآن پاک میں محفوظ ہے اگر انہیں صراطِ مستقیم کی طرف لے آئے ——— کہا کرتے تھے مغربی ممالک سے بڑے بڑے لوگ میرے پاس آتے رہتے ہیں انہیں سمجھانا بہت آسان ہے، ان میں سے ہر کوئی یہاں سے قائل ہو کر گیا ہے۔ ان کی مشکل یہ ہے کہ اسلام کے پیغام کو سمجھ کر وہ یہ نہیں سمجھ پاتے کہ اگر اسلام یہ ہے تو پھر مسلمانوں کی یہ حالت کیوں ہے؟ ———

"مگر میں باہر کیسے جاؤں، آپ یورپ، امریکہ اور کینیڈا کی بات کرتے ہیں، میرے پاس تو کراچی یا پشاور جانے کا سامان نہیں ———!"

دوسری زبانوں میں ترجمہ ہونا چاہیئے، میں کہتا، وہاں جانے سے پہلے ہی ہماری فکر وہاں پہنچ چکی ہو۔'

اس کے لئے عملہ ہونا چاہیئے، وسائل ہونے چاہیئں اور پھر مجھے ایک واقعہ سنایا کہ ایک دفعہ ایک صاحب عراق سے آئے، بڑی شہرت سن رکھی تھی انہوں نے، بڑے متاثر بھی کہ پاکستان

میں کسی نے اس قدر گراں قدر کام کیا ہے ، آئے ادارے میں گئے ، ٹوٹی پھوٹی میزوں پہ رسالوں کے انبار ، ایک چپراسی اور شاید کوئی ایک آدھ اور آنریری ورکر . کہا میں پرویز صاحب سے ملنے سے پہلے ان کے عملے سے ملنا چاہتا ہوں ان کا سکریٹیریٹ دیکھنا چاہتا ہوں' ——— وہ انہیں میرے کمرے میں لے آئے اور انہیں بتایا یہی ہیں پرویز صاحب جو اس کرسی پہ بیٹھے لکھ رہے ہیں یہی ان کا سکریٹیریٹ ہے ، خود لکھتے ہیں ٹائپسٹ بھی نہیں ، سکریٹری ہی نہیں تو سکریٹیریٹ کیا ۔
وہ الٹے پاؤں مڑ گئے ، کہا ان سے مل تو لیجیئے ، آپ تو اتنی دور سے انہیں ملنے کے لیئے آئے تھے ، کہنے لگے نہیں ، ساری بات ہی مجھے جھوٹ معلوم ہوتی ہے ، ایک اکیلا شخص بغیر سکریٹیریٹ کے اتنا کام کر ہی نہیں سکتا' ——— اور بغیر ملے چلے گئے (میں وہاں ہوتا تو انہیں کہتا ذرا ان کی انگشت شہادت تو دیکھو جو مسلسل قلم تھامنے کی وجہ سے اپنی شکل کھو چکی ہے ——— ایسی انگلی میں نے کسی اور قلمکار کی نہیں دیکھی ۔)

اور بات صرف عملے کی بھی نہیں ، ایسے لوگ جو عربی زبان سے واقفیت رکھتے ہوں جس زبان میں ترجمہ مقصود ہو اس پر بھی عبور ہو اور پھر ان تصورات ، ان conceptions سے بھی واقف ہوں جو ان میں مضمر ہیں ——— میں مثال دیتا ہوں صرف انگریزی زبان کی ، اس کی غربت کی مثال جس کی وجہ سے جتنے ترجمے ہوئے ہیں قرآن کے ان conceptions کو پوری طرح (convey) نہیں کر سکتے ——— قرآن میں کسی جگہ اللہ کے لیئے اللہ کا لفظ ہے ، کسی جگہ اسے رب کہا گیا ہے ، کہیں رحمٰن ، کہیں رحیم ، کہیں علیم ، کہیں قہار و جبار ——— مگر انگریزی میں ترجمہ رب کا بھی Lord ہے اللہ کا بھی Lord ، حالانکہ انگریزی کا لفظ Lord نہ اللہ کا متبادل ہے اور نہ کسی صورت رب کی صفتِ ربوبیت کا تصور اپنے اندر رکھتا ہے اور نہ یہ تصوّر پہنچا سکتا ہے ، رحمٰن بھی merciful ہے اور رحیم بھی ——— عربی زبان میں جو باریک ہیں ان کی وجہ سے جو ایک لطیف سا فرق ان میں ہے ، انگریزی کے بس میں کہاں ! ——— میں پچھلے پچاس برس سے اکیلا ہی اپنی سی کوشش میں مصروف ہوں ۔ میرے بس میں تو بس اتنا ہی ہے ——— ۔

آپ نے دوسری جنگِ عظیم کے اس جاپانی سپاہی کا قصہ تو سنا ہی ہوگا جو جنگ ختم ہونے کے پچیس تیس سال بعد ایک جزیرے سے ملا تھا ، اس کا بیرونی دنیا سے رابطہ کٹ چکا تھا اور وہ بدستور شاہِ جاپان کے وفادار سپاہی کی طرح اپنا محاذ سنبھالے تھا ، مدتوں حیران رہا کہ باقی سپاہی کہاں گئے ——— مگر کوئی نہیں بھی ملتا تو کیا ، وہ تو ہے ، جب تک ہے شہنشاہِ جاپان کے نام پہ لڑتا رہے گا اور اسی کے نام پہ جان دے دے گا ———

ان کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا ، آدھی صدی سے زیادہ ایک تنہا سپاہی جو اپنا محاذ سنبھالے رہا ———

اس تنہائی کا احساس انہیں خود بھی تھا ، کوئی ایسی ہی گفتگو ہو رہی تھی ، میرے ذہن میں ایک شعر

گونجنے لگا، میں نے کہا باباجی ایک شعر سناؤں، ناصر کاظمی نے بڑی خوب بات کی ہے، آپ کو ضرور پسند آئے گا، کہنے لگے ہاں سناؤ۔ نئے شاعروں میں بڑا اونچا شاعر ہے، بڑا درد ہے اس کے لہجے میں، میں نے کہا اسی لئے آپ کی نذر کر رہا ہوں۔ کہا ہے

عمر بھر کی نواگری کا صلہ - اے خدا کوئی ہمنوا ہی دے

دیر تک شعر کا لطف لیتے رہے، لطف کیا، سوچ کر اداس سے ہو گئے،

ہاں بڑی اچھی بات کہی ہے —— اور پھر دوسرا مصرع دہرایا

اے خدا کوئی ہمنوا ہی دے!

پرانے شعرا ہی نہیں، پرانے شعر ہی نہیں، نئے شاعروں پر بھی ان کی بڑی گہری نظر تھی،

ایک دن صبح صبح جالب [حبیب جالب] مع بیگم اور بیٹے کے آگئے کہ اس بیٹے کا کچھ کرو، اس کی ٹانگ کی ہڈی مسئلہ بن گئی ہے، مدتوں سے پلاسٹر میں ہے آپریشن ہوئے، مگر جڑتی نہیں —— راحیل بیٹا لاہور جنرل ہسپتال میں آرتھوپیڈک ڈیپارٹمنٹ میں میڈیکل آفیسر تھا، ہم گھر سے ہسپتال پہنچے کہ نیا ایکسرا لیں، کسی سے مشورہ کریں ——

دہاں پہنچ کر جالب نے جب سنا کہ پرویز صاحب وہیں ہیں مجھ سے کہنے لگے ملنے کی اجازت ہو تو میں بھی سلام کر لوں —— میں نے کہا، ہاں، آج کل طبیعت کچھ بہتر ہے، چلیے چلتے ہیں، اور کوئی تو نہیں ہم تم ضرور مل سکتے ہیں، ان دنوں جالب کا اپنا حال بھی پتلا تھا، آپریشن سے نیا نیا اٹھا تھا، لاغر سا، کمزور سا اور بے جان سا تھا۔ سر پہ بڑی سی ٹوپی اور بھی اسے عجیب بنا رہی تھی۔ ٹوپی اتار کے بغل میں داب لی، کہنے لگا انہیں میری بیماری کا نہ بتانا، مناسب معلوم نہیں ہوتا، میں نے کہا، بے فکر رہو، ہم نے آج کل ویسے ہی ان کے لئے خبروں کا بلیک آؤٹ کر رکھا ہے۔

جالب قریب گیا، کہا، علامہ صاحب مجھے پہچانا؟ میں جالب ہوں

مسکرائے، ہاتھ بڑھا کر اسے سینے سے لگایا —— دونوں طرف آنکھیں نم تھیں، کہنے لگے، سیاست نے ہم سے ایک بڑا اچھا شاعر چھین لیا اور ان دنوں تو آپ کا وہ شعر بار بار یاد آتا ہے۔ ؎

کوئی تو پرچم لے کر نکلے اپنے گریباں کا جالب

چاروں طرف سناٹا ہے، دیوانے یاد آتے ہیں

جالب نے کہا، اللہ آپ کو صحت دے، جلدی سے صحت یاب ہو کر گھر آ جائیے، ایک محفل منعقد کریں گے، اس دن شعر سناؤں گا، ڈاکٹر صاحب ہمارے سٹیج سکریٹری ہونگے، جب سے انہوں نے ٹی۔ وی پہ آپ کا انٹرویو کنڈکٹ کیا ہے یہ سکہ بند انٹرویوئیر ہو گئے ہیں ——

جنرل ہسپتال سے گھر آ کر ان کی طبیعت میں کیا کیا اتار چڑھاؤ آئے یہ ایک الگ داستان ہے، گھر والوں نے جو ان کی خدمت کی اس کا ذکر نہیں کروں گا کہ یہ تو ان کی عمر بھر کا شیوہ ہے مگر فزیشن ڈاکٹر شیخ احمد صاحب کا ذکر نہ کیا جائے تو نا انصافی ہوگی وہ ہفتوں کراچی کی ساری مصروفیتیں چھوڑ کر اپنے پرانے دوست "چوہدری صاحب" کے پاس آ کر بیٹھ گئے اور دن رات ان کی دیکھ بھال کرتے رہے۔ کبھی کبھی تو یہ محسوس ہوتے لگتا کہ بس اب چند ہی روز میں پرویز صاحب ایک بار پھر پوری طرح صحت مند ہو جائیں گے ——

میں سوچتا تھا واقعی ایک محفل برپا کریں، احباب کو بلائیں، اور جو آج تک نہیں کہا گیا کہیں؛ — علاج کے لئے انہیں باہر نہیں بھیجا جا سکا حالانکہ ان سے بہت کم تر، کم تر کیا میں کہوں جن کو ان کی شخصیت، علم، سے کوئی نسبت ہی نہ تھی، سرکاری اخراجات پر باہر کے ملکوں میں علاج کے لئے بھیجے گئے، دنیا کے بہترین ہسپتال اور قابل ترین معالج بھی اس گوہر نایاب کی حفاظت کے لئے مہیا کرنا پڑتا تو کم تھا، معاشرے کی، حکومت کی بے حسی کو جوہر ناشناسی کو کیا کہوں ——

جی میں آتی تھی اس محفل میں سبھی کچھ کہوں گا اور پھر صحت یابی کی خوشی میں انہیں، بیمار سوسائٹیوں کو صحت بانٹنے کی مہم پر باہر بھیجنے کا پروگرام بنائیں گے —— مگر یکایک ان کی بیماری نے ایک ایسا پلٹا کھایا کہ،

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا

اور وہ آخری دن، روز میو ہسپتال کے ایک کمرے میں بیہوشی کے عالم میں گزار کر اپنے رب کے حضور جا پہنچے —— !

اور اب ان کا جسد خاکی میرے سامنے خاموش پڑا ہے، چاروں طرف خاموشی ہے، مگر میرے ذہن میں ایک طوفان برپا ہے، ہم کب تک یونہی اپنی آنکھیں ہی نہیں، دلوں کے کواڑ بند کر کے، ذہنوں پہ تالے لگا کر اردگرد سے بے نیاز ماضی کی گلیوں میں سفر کرنے کو جدوجہد کہہ کر فریب میں مبتلا رہیں گے ہر نئی آواز کو سننے سے انکار کریں گے۔ ہر نئی فکر سے بغیر سوچے منہ موڑ لیں گے۔

مگر اس وقت میرا موضوع یہ بھی نہیں، مجھے تو علم وفکر کی دنیا کے اس عظیم نقصان نے جو خلا پیدا کر دیا ہے اس نے گھیر رکھا ہے، —— کہاں سے پھر اپنے مقصد سے لگن رکھنے والا کوئی ایسا دانائے راز پیدا ہوگا، جو مخالفتوں کی پرواہ کئے بغیر پچپن ساٹھ سال ایک ہی لگن ایک ہی دھن میں گزار دے، جالب آؤ پرویز صاحب کی بالیں پہ اپنی آواز کے تمام تر بانکپن اور دردمندانہ بے خوفی کے ساتھ چلاؤ۔

کوئی تو پرچم لے کر نکلے اپنے گریباں کا جالب
چاروں طرف سناٹا ہے دیوانے یاد آتے ہیں !

آج کے بعد کون جانے کب کوئی دیوانہ اس وادیٔ پرخار میں آئے۔ !

ڈاکٹر صلاح الدین اکبر

نالۂ غمِ فراق

پھر کوئی کھیل تماشہ نہ ہوا تیرے بعد
غم کے دریاؤں میں دل ڈوب گیا تیرے بعد

آہیں بھرتا ہوا روتا ہوا لوٹ آیا غریب
دل تری گلیوں میں سو بار گیا تیرے بعد

پھر کوئی بزمِ چراغاں نہ پسند آئی مجھے
بجھ گیا شوق کہ دل ٹوٹ گیا تیرے بعد

غم کے طوفان سے سب بجھ گئے داغوں کے چراغ
پھر یہ ماتم کدہ روشن نہ ہوا تیرے بعد

یوں تو ہر روز یہاں صبح ہوئی ہے روشن
زندگانی کی فضاؤں میں سویرا نہ ہوا تیرے بعد

تیرا ملنا ہوا دشوار کہاں آ کے ملوں
آ کے خود دیکھ لے کیا حال ہوا تیرے بعد

پھر کسی سمت سے آواز نہ آئی مجھ کو
جیسے یہ سارا جہاں روٹھ گیا تیرے بعد

اب یہاں کوئی نہیں جس سے دو باتیں کر لوں
دل کو تنہائی کا احساس ہوا تیرے بعد

تھی ترے دم سے ہی روشن یہ میری محفلِ دل
بن ترے کوئی دیا بھی نہ جلا تیرے بعد

ہم جدائی میں تیری رہ گئے تنہا ہو کر
اس بھری دنیا میں پھر دل نہ لگا تیرے بعد

گھر، کہ خاموش ہوا تیرے چلے جانے سے
زندگی مر گئی اے جانِ وفا تیرے بعد

کون دیکھے میرے ماحول کی ویرانی کو
گھر میرا لٹ گیا برباد ہوا تیرے بعد

زہر لگتی ہے مجھے اب وہ اسے ہستی
کچھ بھی اس دنیا کا اچھا نہ لگا تیرے بعد

ہم نے عارفؔ کو ترے بعد نہ ہنستے دیکھا
زندہ رہ کر بھی وہ زندہ نہ رہا تیرے بعد

(سوگوار بھائی عارف بٹالوی)

افکارِ پرویز کی صدی

محترم المقام غلام احمد پرویز صاحب کی پیدائش ۹ جولائی ۱۹۰۳ء کو ضلع گورداسپور کے ایک مشہور قصبہ بٹالہ میں ہوئی۔ ان کے دادا حنفی مسلک کے ایک جید عالم، چشتیہ خانوادہ کے ایک ممتاز صوفی بزرگ تھے وہ پرویز صاحب کو اپنے علم اور سلوک کا وارث بنانا چاہتے تھے اس طرح ان کی تعلیم و تربیت جس ماحول میں ہوئی وہ شریعت اور طریقت میں ڈوبا ہوا تھا جہاں تک علومِ شریعت اور تفسیر قرآن مجید کا تعلق ہے ان کی تعلیم ٹھیٹھ قدامت پرستانہ انداز سے ہوئی۔ قدامت پرستانہ اندازِ تعلیم کا تقاضہ تھا کہ جو کچھ بتایا جائے بلا چون و چرا اس کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا جائے۔ لیکن پرویز صاحب ابتدا ہی سے ناقدانہ نگاہ کے حامل تھے۔ تقلید اور تنقید کا بیر جنم جنم سے چلا آتا ہے یہی وجہ تھی کہ ان کا سینہ شروع ہی سے اسلاف پرستی کی اندھی تقلید اور دلیل طلبی کے تقاضوں کی کشمکش کی آماجگاہ بننا شروع ہو گیا۔ وہ ایک عرصہ تک احساسِ بے بسی کی اس کش مکش میں وقفِ اضطراب رہے۔ قرآنِ کریم، فطرت کے قوانین کی طرح تمام نوعِ انسان کے لئے کھلا ہوا ضابطہ حیات ہے۔ جسطرح فطرت اپنے حقائق کے انکشاف میں کوئی بخل نہیں برتتی، جو بھی اس کی نقاب کشائی کے لئے ہاتھ بڑھاتے عروسِ فطرت مسکراتی ہوئی بے حجابانہ اس کے سامنے آجاتی ہے، اسی طرح خدا کی کتابِ عظیم بھی اپنی راہنمائی میں ما و شما میں کوئی تفریق نہیں کرتی: وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (۲۹/۶۹) خدا کا ارشاد ہے کہ جو بھی ہمارے بارے میں جدوجہد کرے گا ہم اسے اپنی طرف آنے والے راستے دکھاتے چلے جائیں گے۔ بشرط صداقت کے ساتھ جدوجہد کی گئی ہے۔

انسانوں نے قرآنِ کریم کی روشنی سے بہت تھوڑے سے وقت کے لئے راہنمائی حاصل کی اور اس کے بعد اس شمعِ نورانی پر انسانی تصورات اور خود ساختہ معتقدات کے ایسے دبیز پردے پڑنے شروع ہو گئے کہ کچھ عرصہ کے بعد اس کی روشنی ان پردوں کے نیچے یکسر گم ہو کر رہ گئی یہ حالت صدیوں سے چلی آرہی تھی کہ ہمارے زمانے میں بعض سعید روحوں نے اس شمعِ حقیقت سے انسانی تخیلات و معتقدات کے پردوں کو اٹھانے کی کوشش کی تاکہ اندھیروں میں بھٹکتی ہوئی دنیا، اس دانشِ نورانی سے پھر سے راہنمائی حاصل کر سکے ان میں بعض حضرات تو وہ تھے جنہوں نے قدامت پرست، مذہبی حلقہ کو خصوصیت سے مخاطب کیا اور ان غلطیوں کو ایک ایک کر کے گنایا جن کی وجہ سے وہ قرآن سے اس قدر دور ہو چکے تھے اور بعض وہ جنہوں نے آنے والی نسل کے رجحانات و میلانات کا دقتِ نظر سے مطالعہ کر کے اُسے بتایا کہ عصرِ حاضر کے تقاضے کیا ہیں اور قرآن کریم کسطرح ان تقاضوں

کو پورا کرتا ہے۔ اس طرح انہوں نے کوشش کی کہ ہمارا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ قرآن کے قریب آ جائے اور اس شمع نورانی کو ہاتھ میں لے کر آگے بڑھے۔ اوّل الذکر طبقہ میں علامہ اسلم جیراجپوریؒ کا نام خصوصیت سے لیا جا سکتا ہے اور ثانی الذکر میں علامہ اقبالؒ ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔

محترم پرویز صاحب نے ان دونوں گروہوں کی بصیرتِ قرآنی سے کسب ضیا کیا تھا یہی وجہ تھی کہ ان کی نگاہ قدیم پر بھی تھی اور جدید پر بھی۔ انہوں نے اسلام کی تاریخ کا بڑی گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ وہ عصرِ حاضر کے تقاضوں پر بھی وسیع نظر رکھتے تھے۔ ان کی ساری عمر قرآن کے مطالعہ میں گزری اور قرآنِ کریم کے ساتھ ان کی والہانہ گرویدگی اور عشق کا نتیجہ تھا کہ قرآن ان کے دل کی گہرائیوں میں اتر کر ان کے افقِ ذہن پر چھا گیا۔

محترم پرویز صاحب کی قلمی زندگی کا آغاز ۱۹۲۸ء سے ہوا جب انہوں نے مختلف موضوعات پر لکھنا شروع کیا جو اس زمانہ کے مشہور مجلات مثلاً دار المصنفین کے ماہنامہ "معارف" اور حیدرآباد (دکن) کے رسالہ "ترجمان القرآن" میں شائع ہوئے اور انہوں نے بڑی مقبولیت حاصل کی۔ یہ وہ دور تھا جب مسلمانانِ ہند نے بالعموم اپنا دامن تحریک "جنگ آزادی" سے باندھا ہوا تھا جو بباطن اس ملک میں ہندو راج کے قیام کے منصوبوں پر عمل پیرا تھی۔ ۱۹۳۰ء میں علامہ اقبالؒ نے الٰہ آباد کے مقام پر مسلمانوں کے سامنے ایک واضح نصب العین رکھا اور بتایا کہ اسلام کی رُو سے قومیت کا مدار مذہب پر ہے جغرافیائی حدود، وطن کی چاردیواری، زبان اور نسل کا اختلاف سب غیر فطری امتیازات ہیں۔ نوعِ بشری کی تقسیم صرف ایک معیار پر ہو سکتی ہے۔ یعنی تمام وہ لوگ جو نظامِ خداوندی کے تابع زندگی بسر کرنے کا عہد کریں، ایک قوم کے افراد اور ان کے علاوہ تمام انسان دوسری قوم کے افراد۔ اسی کا نام ایمان اور کفر ہے۔ اس معیارِ تقسیم کی رُو سے ہندوستان کے دس کروڑ مسلمان ایک جداگانہ قوم کے افراد ہیں۔ ہندو اور مسلمان مل کر ایک قوم کسی صورت میں نہیں بن سکتے۔ مسلمانوں کے نزدیک آزادی سے مفہوم یہ نہیں کہ غیر ملک کے حکام (انگریز) یہاں سے نکل جائیں اور ان کی جگہ یہاں کی ہندو اکثریت کی حکومت قائم ہو جائے۔ ان کے نزدیک یہ بھی اسی طرح کی غلامی ہو گی جس طرح انگریز کی حکومت۔ ان کے لئے غلامی ہے۔ آزادی سے ان کا مفہوم یہ ہے کہ یہ اپنے تصورات و معتقدات کے مطابق زندگی بسر کرنے پر قدرت رکھتے ہوئے دنیا میں قرآنی نظام رائج کر سکیں اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ان کا ایک مستقل مسکن ہو کیونکہ ہر دولتی نظام کے قیام کے لئے زمین کا ہونا لازمی ہے۔ ہندوستان کی موجودہ شکل میں اس کی آسان صورت یہ ہے کہ ہندوستان کے مغربی اور مشرقی علاقوں میں جہاں حسنِ اتفاق سے مسلمانوں کی اکثریت ہے، ان کی الگ حکومت قائم ہو جائے۔

ہندو جو عرصۂ دراز سے مسلمانوں پر حکمرانی کے خواب دیکھتا آ رہا تھا، مسلمانوں کے اس مفہومِ آزادی اصولِ حریت سے چراغ پا ہو گیا اور اس نے چلّانا شروع کر دیا کہ مذہب ایک نجی عقیدہ کا نام ہے۔

جیسے سیاست سے کوئی واسطہ نہیں ہونا چاہیئے۔ ہندوؤں کی طرف سے تو یہ مخالفت ہونی ہی تھی لیکن بدقسمتی سے مسلمانوں میں سے ہی انہیں ایسے لوگ مل گئے جو مسلمانوں کے ان مطالبات کی مخالفت میں ان کے ہمنوا ہو گئے۔ ایک طرف مسلمانوں کے اس دعوے کی وکالت کرنے والا ایک ایسا شخص¹ تھا جسے امورِ دینیہ کے عالم ہونے کا کبھی دعویٰ نہ ہوا اور دوسری طرف اس مطالبہ کی مخالفت میں وہ گروہ² پیش پیش تھا جو اپنے آپ کو "حاملانِ دینِ مبین اور مفتیانِ شرع متین" کے القابات سے متعارف کراتا تھا مسلمانانِ ہند کی دس سال کی تگ و تاز اور جدوجہد خود اپنوں ہی کی مخالفت کے مقابلہ میں صرف ہو گئی۔

(مولانا) ابوالکلام آزاد جو نیشنلسٹ علماء کے امام تھے، مسلمانوں کے اس مطالبہ تقسیم ہند کی مخالفت میں پیش پیش تھے سرزمین ہند میں ان کا طوطی بولتا تھا۔ دنیائے علم و ادب میں ان کا نام بین الاقوامی شہرت کا حامل تھا ۳۲/۱۹۳۱ میں ان کی تفسیر "ترجمان القرآن" کی پہلی جلد منظرِ عام پر آئی تو اربابِ ذوق اور خصوصاً اہلِ ہنود نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ملک کی ممتاز شخصیتوں نے اس کی مدح و ستائش میں زمین و آسمان کے قلابے ملا ڈالے۔ نامور مجلات میں اس پر فلک پیما تبصرے شائع ہوئے۔ اس تفسیر میں ابوالکلام مرحوم نے لکھا تھا کہ "عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں" فلہذا کسی ایک مذہب کو کسی دوسرے مذہب پر کوئی فوقیت حاصل نہیں۔ ہندوؤں کو یہ تفسیر اس قدر بھائی کہ کانگریس نے اُسکا ہندی میں ترجمہ کرایا اور اس کی عام اشاعت کی۔ محترم پرویز صاحب کا قرآن کریم سے والہانہ عشق اور جراٴتِ ایمانی کی داد دینی پڑتی ہے کہ اس دور کے "امام" کی اس بے ہودہ تفسیر پر بے لاگ اور بھرپور تنقید کی جو ملک کے معروف ماہنامہ "معارف" کے جنوری ۱۹۳۳ء کے شمارہ میں شائع ہوئی۔ اس تنقید نے مسلمانوں کی آنکھیں کھول دیں اور ملک کے علمی حلقوں میں ہلچل مچا دی۔

میکانکی اسلام

قارئین کرام مجھے معاف فرمائیں کہ میں محترم پرویز صاحب کے اس تاریخی نوعیت کے حامل مضمون کا سن اشاعت تحریر میں لانے سے قاصر ہوں لیکن اس امر کے متعدد ثبوت میرے پاس موجود ہیں کہ یہ مضمون ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۴ء کے کسی سال میں شائع ہوا تھا اس کا ایک بین ثبوت ہمیں عدالت کے ایک فیصلہ سے بھی ملتا ہے اس کا پس منظر معلومات افزاء ہے۔

۱۹۲۶ء میں ریاست بہاولپور کے ایک شہر بہاولنگر کی عدالت میں ایک مقدمہ دائر ہوا جسمیں تصفیہ طلب امر یہ تھا کہ "احمدیوں" کا شمار مسلمانوں میں کیا جا سکتا ہے یا وہ دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔ نو سال تک یہ مقدمہ زیرِ سماعت رہا اور اس دور کے جید علماء کرام نے اس کی پیروی کی۔ لیکن بات کسی ٹھکانے نہ لگ سکی ۱۹۳۵ء میں وہاں کے ڈسٹرکٹ جج، محمد اکبر (مرحوم)

۱۔ قائد اعظم محمد علی جناحؒ ۲۔ نیشنلسٹ علماء

نے اس کا فیصلہ صادر کیا جس میں لکھا کہ نو سال تک یہ مسئلہ زیر بحث رہا کہ مقام نبوت کیا ہے لیکن بات واضح نہ ہو سکی۔ اتفاقیہ ایک دن میں نے ایک رسالہ میں چوہدری غلام احمد پرویز کا ایک مضمون پڑھا جس سے یہ سارا مسئلہ حل ہو گیا اور مجھ پہ یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ احمدیوں کا شمار مسلمانوں میں نہیں کیا جا سکتا۔ وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہیں۔ اپنے اس تاریخی فیصلہ میں ڈسٹرکٹ جج نے یہ بھی تحریر کیا کہ نبوت کی جو حقیقت انھوں نے بیان کی ہے میری رائے میں اس سے بہتر اور کوئی بیان نہیں کی جا سکتی۔ اور میرے خیال میں فریقین میں سے کسی کو اس سے انکار بھی نہیں ہو سکتا۔ (ص ۱۰۷)

محترم پرویز صاحبؒ کو منکرِ شانِ رسالت کہنے والے بدبختوں کیلئے فاضل جج کا یہ فیصلہ اور محترم پرویز صاحب کیلئے یہ ریمارکس، درسِ عبرت کا باعث ہونے چاہئیں یہ توفیق نہ کسی ابوالکلام کو حاصل ہو سکی نہ کسی امام الہند، شیخ الہند اور مفتی شرعِ متین کے حصہ میں آسکی۔ بارگاہِ رسالت میں یہ شرف حاصل ہوا تو احمدؐ کے ایک غلام (پرویز صاحبؒ) کو حاصل ہوا۔

طلوعِ اسلام کا اجراء

مسلم لیگ کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز ۱۹۳۸ء سے ہوا اور اپریل ۱۹۳۸ء میں طلوعِ اسلام پہلی بار ایک جریدہ کی حیثیت سے منظرِ اشاعت پر آیا۔ یہ وہ نازک مرحلہ تھا جب قائداعظمؒ نے انگلستان سے واپس پہنچ کر سفینۂ ملت کی ناخدائی کا نازک فریضہ اپنے ذمہ لیا تھا۔ ملتِ اسلامیہ کی یہ کشتی ہر چہار اطراف سے طوفانوں میں گھری ہوئی تھی۔ کشتی کے مسافر پریشانیٔ فکر و نظر کا شکار تھے۔ آزادی اور جمہوریت کے پردے میں ہندو قوم کانگریس کے جھنڈے تلے اپنی صفوں کو منظم کر چکی تھی۔ مسلمانوں کے چوٹی کے مذہبی پیشوا واردھا آشرم اور آنند بھون کے آستانوں کا طواف کر رہے تھے۔ منظم ہندوؤں کی اکثریت کروڑوں مسلمانوں کی منتشر اقلیت کو اپنی ابدی غلامی کے دام میں جکڑنے کے منصوبے مکمل کر چکی تھی اور وہ وقت قریب تھا جب ہماری احساسِ خودی سے بیگانگی اور بے نصیبی ہمارے قومی وجود اور ملّی تشخص کو ہمیشہ کے لئے ختم کر کے رکھ دے اور ہم ہمیشہ کے لئے ہندو سامراج کی بدترین غلامی اور محکومی کے شکنجوں میں ملیا میٹ ہو کر رہ جائیں۔ اس سانحہ قیامت میں جب قائداعظم مرحوم مغفور مسلمانوں کی سیاسی قیادت کے لئے میدان میں اترے اور انہوں نے تسبیح کے ان بکھرے ہوئے دانوں کو ایک مسلکِ تنظیم میں پرونے کا کام سنبھالا تو ان کی راہ میں مشکلات و موانعات کے پہاڑ سر اٹھائے کھڑے تھے وہ بساطِ سیاست پر اپنے مدِمقابل مہروں کو مات دینے کی بھرپور صلاحیت رکھتے تھے۔ ان کے تدبر اور فراست نے دشمنوں میں ایک تہلکہ سا ضرور مچا دیا تھا لیکن ایک محاذ ایسا بھی تھا جو قائداعظمؒ کے بس کا نہ تھا۔ یہ محاذ تھا ان مخالفین کی مدافعت کا جو قال اللہ اور قال الرسولؐ کے نقاب میں آگے بڑھ رہے تھے یہاں معاملہ مذہبی پیشوائیت کے ان مہروں سے تھا جنہیں جبہ و دستار کے تقدس میں دشمن اپنا آلۂ کار بنا کر آگے بڑھ چکا تھا اور یہ "مفتیانِ شرعِ مبین"، خوفِ خدا اور تقاضائے دین و ایمان سے بے نیاز ہو کر یہ فتوے صادر فرما رہے تھے کہ واردھا آشرم کے مہاتما اور آنند بھون کے پنڈت بروئے شریعت ہمارے سیاسی امام قرار پا سکتے ہیں۔ کیونکہ سیاست کو مذہب سے کوئی واسطہ نہیں۔ اسلام ہمارا پرائیویٹ معاملہ ہے اور ملکی سیاسیات اور آزادی کی جد و جہد ہندوؤں، مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں پر مشتمل

متحدہ قومیت کا مسئلہ!

اندازہ لگائیے کہ اس محاذ پر قائداعظمؒ کو کس قدر مضبوط دست و بازو کی ضرورت تھی۔ جبکہ دستار میں لپٹے ہوئے لات و منات جنہیں دشمنوں نے مقدمۃ الجیش بنا کر آگے بڑھایا تھا متحدہ قومیت کا راگ الاپ رہے تھے وہ منبر و رسول پر کھڑے ہو کر نعرہ بلند کر رہے تھے کہ عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔ فلہٰذا کسی مذہب کو کسی دوسرے مذہب پر فوقیت حاصل نہیں۔ مذہب صرف پوجا پاٹ کا نجی معاملہ ہے سیاست، ملک گیری یا حکمرانی اس کے حیطۂ اختیار سے باہر ہے!

ہماری تاریخ کا یہی وہ نازک مرحلہ تھا جہاں تحریکِ قرآنی کے داعی محترم پرویز صاحب قائداعظمؒ اور علامہ اقبالؒ کے ایماء پر آگے بڑھے اور طلوع اسلام فکرِ قرآنی کی شمع رخشندہ کو تھامے ہوئے معرکۂ دین و وطن کی رزمگاہ میں جلوہ بار ہوا۔ اور وارد ھاکے ساحری نے جو رسیاں سانپ بنا کر آگے بڑھائی تھیں انہیں قرآنی دلائل و براہینِ قاطعہ کے عصائے کلیمی سے زیر و زبر کرتا چلا گیا یہ پرویز اور اس کا طلوع اسلام ہی تھا جس نے شیخ الہند کے نعرہ وطنیت کے پرخچے اڑا کر رکھ دیئے اور ملتِ اسلامیہ کے دل و دماغ پر یہ قرآنی حقیقت نقش کی کہ ہماری ملت کی اساس صرف دین و ایمان کی بنا پر اشتراک ہے۔ وطن کا سومنات مسلمانوں کی قومیت کی اساس نہیں بن سکتا۔ اس مجلّہ نے تحریکِ پاکستان کی تاریخ میں ناقابلِ فراموش خدمات سرانجام دیں۔ یہ دور محترم پرویز صاحب کی جنون آمیز سرگرمیوں کی شدت کا تھا۔ دفتر کی ملازمت، ماہنامہ طلوعِ اسلام کا اجراء۔ مخالفینِ پاکستان سے محاذ آرائی جس کی صفوں میں ملک کے مشہور ترین علماء شامل تھے دہلی اور شملہ کے مختلف مراکز میں قرآنی موضوعات پر تقاریر اور نئی دلی کی سیکرٹریٹ کی مسجد میں خطباتِ جمعہ، اقبال ڈے کے اجتماعات میں تحریکِ پاکستان کی تائید میں خطابات۔ معارف القرآن اور تبویب القرآن کی تدوین، غرض ایک چومکھی محاذ تھا جس سے پرویز صاحب نبرد آزما تھے ماہنامہ طلوع اسلام کا پہلا شمارہ ۸۔ اپریل ۱۹۳۸ء کو شائع ہو گیا تھا لیکن انتظامی سہولت کی خاطر اسے مئی کا پرچہ قرار دیا گیا تھا۔

دینِ فطرت

ماہنامہ طلوع اسلام کے پہلے شمارہ میں محترم پرویز صاحب کا مضمون "دینِ فطرت" کے عنوان سے شائع ہوا جس میں بتایا گیا کہ اسلام مذہب نہیں دین ہے۔ دین، زندگی کا عملی نظام ہے اور نظام ایک ہی سچا ہو سکتا ہے اس نظام میں خدا پرستی سے مقصود ہوتا ہے، خدا کے قوانین کو دنیا میں عملاً نافذ کرنا اور نیک عملی کے معنی ہوتے ہیں ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنا۔ اس کے برعکس مذہب نام ہوتا ہے خدا اور بندے کے درمیان پرائیوٹ تعلق کا۔ جو ہر قسم کے نظام میں قائم کیا اور باقی رکھا جا سکتا ہے۔

نظریۂ قومیت

بہت کم لوگوں کو اس کا علم ہوگا کہ تقسیم ہند سے قبل ماہنامہ طلوع اسلام میں جو مضامین رازی اور ایک مسلمان کے نام سے شائع ہوتے تھے وہ محترم پرویز صاحب ہی کے تحریر کردہ ہوتے تھے۔ مئی کے طلوع اسلام میں رازی کے نام سے " نظریہ قومیت

قرآن اور سنت کی روشنی میں" کے عنوان سے شائع ہوا۔ ۲۱ فروری ۱۹۳۸ء کے اخبار مدینہ میں مولانا حسین احمد صاحب کا ایک بیان شائع ہوا تھا جس میں مولانا موصوف نے کہا کہ "موجودہ زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں نہ کہ نسل اور مذہب سے"۔ کہ یہ دعویٰ کہ اسلام کی تعلیم، قومیت کی بنیاد جغرافیائی حدود یا نسلی وحدت یا رنگ کی یکسانی کے بجائے شرفِ انسان اور اخوتِ بشری پر رکھتی ہے مجھے معلوم نہیں کہ کون سی نصِ قطعی یا ظنی سے ثابت ہے"۔ محترم پرویز صاحب نے اپنے اس مقالہ میں قرآن کریم کی متعدد آیات۔ احادیثِ نبویؐ، ہجرت کے واقعات کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا کہ قومیں آئیڈیالوجی کی بناء پر وجود میں آتی ہیں اوطان کی بنیاد پر نہیں۔

سوراجی اسلام

ہندو اور نیشنلسٹ علماء عوام کو یہ کہہ کر دھوکا دیتے ہیں کہ جس آزادی کے طالب ہندو ہیں اس میں مسلمانوں کو پوری مذہبی آزادی ہوگی۔ لہٰذا سب سے پہلے یہ بتانا ضروری تھا کہ مسلمانوں کے نزدیک مذہب کا صحیح مفہوم کیا ہے اور جس قسم کے مذہب کی آزادی ہندو اکثریت کی حکومت میں حاصل ہوگی اس کی حقیقت کیا ہے اس کے لئے جون ۱۹۳۸ء میں جناب رازی کے قلم سے ایک مبسوط مقالہ بعنوان "سوراجی اسلام" شائع ہوا جس نے فریقِ مقابل کی ان فریبیوں کے نقاب اُلٹ کر رکھ دیئے۔

جماعتی زندگی

طلوع اسلام کے میدانِ سعی و عمل کا ایک گوشہ تو ملتِ اسلامیہ کے اس مطالبہ کی تائید میں تھا جسے نظریۂ پاکستان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لیکن طلوع اسلام کے نزدیک مسلمانوں کا یہ مطالبہ مقصود بالذات نہ تھا بلکہ ایک بلند و بالا مقصدِ عظیم القدر کے حصول کا ذریعہ تھا۔ اصل مقصود یہ تھا کہ ہم اپنی زندگی کو قرآنی خطوط پر متشکل کر سکیں اور چونکہ اس کے لئے کسی ایسے خطۂ ارض کا ہونا ضروری تھا جس میں کسی غیر کا دخل نہ ہو، اس لئے پاکستان کا حصول اس کیلئے لازمی تھا۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ حصولِ خطۂ ارض کی کوششوں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے نگاہوں کے سامنے وہ خاکہ بھی رکھتے چلے جائیں جس کے مطابق اس خطۂ زمین پر ایک جدید عمارت کی تعمیر ہونی تھی۔ اس باب میں اہم مضامین کا ایک مستقل سلسلہ بھی جاری رہا۔ چنانچہ جولائی ۱۹۳۸ء میں محترم پرویز صاحب کا ایک حقیقت کشا مضمون "جماعتی زندگی" شائع ہوا جس میں بتایا گیا کہ لَا اِسْلَامَ اِلَّا بِالْجَمَاعَۃِ جماعت کے بغیر اسلام نہیں ہے۔ مرکز سے وابستگی۔ اطاعت اور باہمی اخوت ہی ایمان کی کسوٹی ہے۔

واردھا کی تعلیمی اسکیم

مسٹر گاندھی کو جب یہ احساس ہوا کہ مسلمانوں کی آئندہ نسلوں پر حکومت کرنا اس وقت تک ممکن نہ ہوگا جب تک ان کے ذہنی تصورات کو نہ بدل دیا جائے اور اس کی آسان ترین شکل یہ ہے کہ ان کے نصابِ تعلیم کو بدل دیا جائے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے ایک تعلیمی کمیٹی تشکیل ہوئی جس نے شروع ۱۹۳۸ء میں اپنی رپورٹ پیش کی۔ اس سکیم کا نام "واردھا کی تعلیمی سکیم" تھا۔ اس سکیم میں ایسے ایسے زہریلے

نشتر چھپا رکھے تھے کہ اگر یہ خدانکردہ کہیں مسلمانوں میں رائج ہو جاتی تو یہ نشتر ان کی آئندہ نسلوں رگِ جان میں پیوست ہو جاتے۔ اگست ۱۹۳۸ء کے طلوع اسلام میں اس دامِ ہمرنگِ زمین کا اس وضاحت سے تجزیہ کیا گیا کہ ان کی خفیہ تدبیریں سب برباد ہو کر رہ گئیں۔ دنیا نے دیکھا کہ واردھا سکیم کے پرزے پرزے فضائے آسمانی میں اڑ رہے تھے۔ محترم پرویز صاحب نے اس نصاب کا تجزیہ ایسے بصیرت افروز انداز سے کیا، اس پُر فریب زریں نقاب کو اس حسین انداز سے تار تار کیا کہ ان کے مضمون کا پمفلٹ چھ مختلف زبانوں میں لاکھوں کی تعداد میں شائع ہوا۔ برصغیر کے گوشے گوشے تک پہنچا اور چند ہی دنوں میں اس سازش کا ایک مکروہ گوشہ بے نقاب ہو کر منظرِ عام پر آگیا اور واردھا کے سامری اور آنند بھون کے ہامان عرقِ ندامت سے شرابور پیشانیاں لئے دنیا کے سامنے گردنیں جھکائے کھڑے تھے۔ واردھا سکیم کے تحت نصاب تعلیم کی لاکھوں کتابیں خاموشی سے سمندر میں غرق کرنی پڑیں۔ ڈھول کا پول کھل گیا۔ دشمن کی گھناؤنی سازش زیر و زبر ہو کر رہ گئی۔ مذہبی پیشوائیت کی اغیار پرست کٹھ پتلیاں بے نقاب ہو کر ملت کے سامنے آگئیں۔ قوم کے وہ لاکھوں شاہین بچے جنہیں آگے چل کر تحریک پاکستان کے علمبردار اور ملت کے پاسبان بننا تھا اس میٹھے زہر (SLOW POISON) سے بال بال بچ گئے جو ان کے لئے نہایت مکاری سے تیار کیا گیا تھا

زبان کا مسئلہ

تعلیم بدلنے کے ساتھ ہی زبان بدلنے کا سوال پیدا ہوتا ہے چنانچہ مسلمانوں کی جداگانہ ہستی کو مٹانے کے لئے جو پروگرام وضع کیا گیا تھا اس میں زبان کی غیر محسوس تبدیلی کو خاص اہمیت دی گئی تھی، سیدھا سادھا مسلمان اس حسین فریب سے قطعًا نا آشنا تھا اسے اس عظیم خطرہ سے آگاہ کرنے کے لئے اکتوبر ۱۹۳۸ء کے طلوع اسلام میں "زبان کا مسئلہ" کے عنوان سے ایک مفصل مقالہ شائع ہوا جس میں بتایا گیا کہ مسلمان اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں اور انہیں اس غلط فہمی میں اور زیادہ مبتلا کیا جا رہا ہے کہ زبان کا مسئلہ محض ایک ادبی مسئلہ ہے کسی قوم کے مذہب اور تہذیب سے اس کا کیا تعلق؟ لیکن انہیں یہ معلوم نہیں کہ کسی قومیت کو بنانے اور بگاڑنے میں، کسی تہذیب کو زندہ رکھنے اور فنا کر دینے میں، کسی قوم کا مذہب سے تعلق باقی رکھنے اور منقطع کر دینے میں، زبان کا ایک غیر معمولی کردار ہوا کرتا ہے جس قوم کے پاس اپنی زبان اور اپنا رسم الخط ہے وہ ایک مستقل قوم ہے اور جس قوم کی زبان میں خود اپنا لٹریچر موجود ہے اور ترقی کر رہا ہے وہ ایک زندہ قوم ہے جس وقت یہ قوم اپنی زبان چھوڑنے اور اپنا رسم الخط بدل دینے پر آمادہ ہو جائے اس وقت سمجھ لینا چاہئے کہ وہ اپنی قومیت کو بدل رہی ہے، اپنی تہذیب سے رشتہ منقطع کر رہی ہے، اپنی قبر اپنے ہاتھوں کھود رہی ہے، غیر محسوس طور پر تباہی و بربادی کے عمیق غاروں کی طرف کھنچی جا رہی ہے۔ اس مضمون کا پمفلٹ بھی بارہا چھپا اور اطراف و جوانب میں پھیل گیا۔ واردھا کی تعلیمی سکیم

اور تبدیلیٔ زبان کی گہری سازش سے مسلمانوں کو بر وقت متنبّہ کرنا اور اس کا سدِّ باب کرنا طلوع اسلام اور محترم پرویزؔ صاحب کا برِصغیر کے مسلمانوں پر ایسا احسانِ عظیم ہے جسے موجودہ اور آئندہ نسلیں کبھی فراموش نہ کر سکیں گی۔

مرکزیت

نومبر ۱۹۳۸ء میں محترم پرویزؔ صاحب کا ایک معرکۃ آراء مقالہ بہ عنوان "مرکزیّت" طلوع اسلام کے اوراق کی زینت بنا جس میں موصوف نے وضاحت سے یہ امر مسلمانوں کے ذہن نشین کرایا تھا کہ قوموں کی ہستی کا مدار ان کی مرکزیّت سے وابستہ ہوتا ہے، ان کی جداگانہ حیثیت اور امتیازی خصوصیت اسی نقطۂ ماسکہ سے وابستہ ہوتی ہے اگر ان کی مرکزیت میں خلل وانتشار واقع ہو جائے تو ان کی ملی حیثیت کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ قوموں کا خصوصی امتیاز ان کا اندازِ فکر ہے جو تہذیب و تمدّن کے محسوس پیکروں میں دنیا کے سامنے آتا ہے اور تہذیب و تمدّن کی محافظ اس قوم کی قوّت و سطوت ہوتی ہے۔ دنیا میں کوئی تہذیب زندہ نہیں رہ سکتی جب تک اس کے پس پشت قوت و اقتدار موجود نہ ہو۔ قوت اور حکومت کا مرکز قوم کا دارالسلطنت ہوتا ہے۔ ایک مسلمان کے دل میں اس کی اہمیت اس درجہ پیوست اور محکم ہونی چاہیئے کہ وہ دنیا کے کسی گوشے میں ہو، اس کے رحجاناتِ قلب و میلاناتِ نظر کی طنابیں غیر محسوس طور پر اس کے مرکز سے وابستہ ہوں۔ جس طرح فضا کی پہنائیوں میں گم ہو جانے کے باوجود پرندے کی نگاہ اپنے شاخِ آشیانہ سے مربوط رہتی ہے۔ مرکز کا یہی جذب و کشش افرادِ قوم کو اس طرح باہمدگر متمسک رکھتا ہے جس طرح اجرامِ فلکی اپنے اپنے محور کے گرد نظامِ کشش سے سرگرم عمل رہتے ہیں۔ لیکن جونہی یہ مرکزی کشش ختم ہوتی ہے وہ ریت کے ذرّوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں جنہیں ہوا کے تیز جھونکے اور پانی کی ہر موج جدھر جائے اڑا کر لے جاتی ہے اور جہاں چاہے بہا لے جاتی ہے۔

۱۹۳۸ء کے طلوع اسلام میں محترم پرویزؔ صاحب کے اور متعدد مضامین مثلاً "تکلف برطرف" معارف القرآن، گفتگوئے مصالحت اور اسلامی معاشرت کے عنوانات سے شائع ہوئے۔

متحدہ قومیت

تحریک پاکستان کی بنیاد اس اٹل دعوے پر تھی کہ اسلام کی رُو سے قومیت کا مدار مذہب پر ہے۔ جغرافیائی، نسلی، لسّانی، و وطنی امتیازات مسلمان کے لئے وجہِ جامعیت نہیں ہو سکتے اس لئے ہندوستان کے اطراف واکناف میں پھیلے ہوئے تمام مسلمان، باوصفِ اختلافاتِ نسل و رنگ و زبان و حدود، سب ایک قوم کے افراد ہیں اور ان کے مقابل تمام غیر مسلم ایک الگ قوم کے افراد۔ یہی وہ دعوت تھی جسے عام کرنے کے لئے خدائے قدوس کی طرف سے حضرات انبیاء کرام کا سلسلۂ رشد و ہدایت وجود میں آیا۔ جب حضرت نوح ؑ سے کہا گیا کہ تمہارا بیٹا تم میں سے نہیں ہے کیونکہ وہ شیوۂ حق پرستی میں تمہاری جماعت سے ہم آہنگ نہیں تو وہ اسی دعوت کی پکار تھی اور جب حضرت ابراہیم ؑ نے اپنے باپ اور قوم سے کہا کہ ہم تم سے، اور اللہ کو چھوڑ کر جن کی تم معبودیت اختیار کیے ہوئے ہو ان سے، قطع علائق کرتے ہیں

تو یہ بھی وہی صوت سرمدی تھی۔ حضرت لوطؑ نے اپنی رفیقۂ حیات سے اور جناب مسیحؑ نے اپنی قوم سے برأت کا اظہار کیا تھا تو وہ بھی اسی اصول محکم کا اعادہ تھا اور پھر جب ان سب سے آخر بدر و حنین کے میدانوں میں باپ کے مقابل بیٹا اور بھائی کے سامنے بھائی شمشیر بدست استادہ تھے تو اس وقت دنیا نے انسانوں کی اس تقسیم ازلی و فطری کو اپنی مکمل صورت میں مشہور دیکھ لیا تھا۔ یہی وہ بظاہر دنیا جہان سے نرالی لیکن درحقیقت عین مطابق فطرت تقسیم تھی جس کی رُو سے حبش کے بلالؓ، روم کے صہیبؓ، فارس کے سلمانؓ تو اپنوں میں سے تھے لیکن خود خاکِ مکّہ کا ابولہب بیگانوں میں سے تھا۔

حضرت علامہ اقبالؒ کے نظریۂ قومیت کے جواب میں (مولانا) حسین احمد صاحب نے جو جواب پمفلٹ کی صورت میں شائع کیا تو ادارۂ طلوع اسلام نے ضرورت محسوس کی کہ اس کا جواب شائع کیا جائے چنانچہ جنوری ۱۹۳۹ء کے طلوع اسلام میں رازی کے نام سے محترم پرویز صاحب کا ایک مقالہ اس کے جواب میں شائع ہوا جس میں موصوف نے مدنی صاحب کے دلائل کا جواب کتاب و سنت کی روشنی میں دیا اور شرح و بسط سے بتایا کہ اسلام میں متحدہ قومیت کا معیار کیا ہے اور ہندی لغت میں اس کی تشریح کیا۔ اسلام کا نظریہ، فرنگی یا ہندی نظریہ سے کس طرح متصادم ہے اور مغرب کے ایجاد کردہ قومی تصور میں کیا کیا مفاسد پوشیدہ ہیں۔

عرضداشت بخدمت علماء کرام

ملّتِ اسلامیہ کی اکثریت چند سال کی مسلسل جدّوجہد کے بعد مسلمانوں کی جداگانہ قومیت اور الگ حکومت کے دعوے کی تائید میں تھی۔ قومیت پرست گروہ ان کی مخالفت میں دن رات مصروف تھا اور للعجب کہ اس مخالفت میں جمیعت العلماء ہند صف اوّل میں تھی۔ آٹھ نو برس سے جمیعت کا کوئی سالانہ اجتماع نہیں ہوا تھا لیکن مسلم لیگ اور قائد اعظمؒ کی مخالفت کے جوش نے ان میں پھر سے حرکت پیدا کی اور آوائل مارچ ۱۹۳۹ء میں دہلی میں ان کا اجتماع ہوا۔ یہ بڑا نازک وقت تھا اور ایسے وقت میں مسلمانوں کے ملّی مطالبہ کی مخالفت میں ایک ایسا اجتماع خاص، خاص اہمیت رکھتا تھا۔ طلوع اسلام نے اپنے غلط رو بھائیوں کو سیدھا راستہ دکھانے کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ چنانچہ اس اجتماع کی تقریب پہ ادارہ کی جانب سے محترم پرویز صاحب کا ایک جامع مقالہ بعنوان "عرضداشت بخدمت علماء کرام" پمفلٹ کی شکل میں شائع ہوا اور جلسہ کے پہلے دن اسے مفت، خاص اہتمام سے تقسیم بھی کیا۔ اللہ تعالیٰ نے طلوع اسلام کی اس کوشش کو مشکور فرمایا اور عوام اس فریب کا شکار ہونے سے بچ گئے جو مذہب کے نقاب میں کھیلا جا رہا تھا۔

خدا کی بادشاہت

اس باب میں سب سے اہم سوال جو اکثر سامنے آتا تھا یہ تھا کہ قرآن جس قسم کے دولتی نظام کی تشکیل چاہتا ہے اس کے اصول و مبانی کیا ہیں چنانچہ اس موضوع پر مئی ۱۹۳۹ء کے طلوع اسلام میں محترم پرویز صاحب کا مضمون "خدا کی بادشاہت" شائع ہوا جس میں وضاحت سے بتایا گیا کہ دنیا میں قوّت اور دولت کا غلط مصرف فسادِ آدمیت کا باعث ہوتا ہے اور قرآن جس نظام کو دنیا میں وجہ شرف انسانیت قرار دیتا ہے اس میں قوّت

اور دولت کے غلط استعمال کا شائبہ تک باقی نہیں رہتا اور احترام آدمیت کہ جو درحقیقت سرچشمہ ہے ہر قسم کے شرف و مجد کا، اس نظام کا بنیادی اصول قرار پاتا ہے۔

اسلام اور مذہبی رواداری

اسلام کے دولتی نظام میں غیر مسلموں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائیگا یہ سوال تحریکِ پاکستان کے سلسلہ میں خاص اہمیت رکھتا تھا کہ یہاں کی آبادی میں ایک نمایاں حصہ غیر مسلموں کا بھی تھا۔ چنانچہ اس موضوع پر جون ۱۹۳۹ء کے پرچہ میں محترم پرویز صاحب کا ایک اہم مقالہ "اسلام اور مذہبی رواداری" کے عنوان سے طلوعِ اسلام کے صفحات کی زینت بنا جس میں موصوف نے قرآنی نصوص اور تاریخی نظائر و شواہد سے اس حقیقتِ مستور کو بے نقاب کیا تھا کہ قرآنی نظام کے متعلق غیر مسلم جانبدار اور متعصب مورخین نے دنیا کو کس قدر فریب میں مبتلا رکھا ہے اور اس طرح اس کے حسین چہرے کو کس قدر بھیانک نقوش میں پیش کیا ہے؟

کانگریس بے نقاب

طلوع اسلام کی شروع ہی سے یہ پکار تھی کہ کانگریس کی تحریک مسلمانوں کے لئے آزادی کی تحریک نہیں بلکہ یہ ایک خالص ہندو نیشنلزم کی تحریک ہے اور مقصد اس سے مسلمانوں کی ملی خصوصیات کو مٹا کر ملک میں "رام راج" کا قیام ہے قومیت پرست مسلمان اس کی تردید کرتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ تحریک خالص سیاسی تحریک ہے اس میں ہندوؤں کے پیشِ نظر کوئی ایسے عزائم نہیں لیکن یہ راز کب تک مستور رہتا۔ اگست ۱۹۳۹ء میں کانگریس کے جنرل سیکرٹری اچاریہ کرپلانی کی طرف سے کانگریس کے عزائم و مقاصد سے متعلق ایک تفصیلی بیان شائع ہوا جس میں اس نے کھلے کھلے الفاظ میں اس حقیقت کا اعلان کیا کہ کانگریس کی تحریک اس فلسفۂ زندگی کے احیاء و ترویج کی تحریک ہے جسے مہاتما گاندھی پیش کر رہے ہیں کانگریس کو محض سیاست کے دائرہ تک محدود سمجھنا غلطی ہے اس کی تحریک ہر گوشۂ زندگی کو محیط ہے۔ چنانچہ ستمبر ۱۹۳۹ء کے طلوع اسلام میں اس بیان پر تفصیلی تجزیہ شائع ہوا جس میں قومیت پرست مسلمانوں سے پوچھا گیا کہ حضرت یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیر ما! کانگریس کی اسطرح نقاب کشائی سے بہت سی سعید روحیں اپنی غلط روی پر متنبہ ہوگئیں اور باقی وہ رہ گئے جن کے پیشِ نظر کچھ اپنے مقاصد اور مفادات تھے۔

مسلمان کی زندگی

اکتوبر ۱۹۳۹ء میں محترم پرویز صاحب کا عظیم القدر مضمون "مسلمان کی زندگی" شائع ہوا جس میں انہوں نے اپنے مخصوص اور دلکش انداز میں بتایا کہ مسلمان کی حقیقی زندگی کس قسم کی ہوتی ہے اور عجمی تصوّرات اور غیر قرآنی نظریات نے اسے کیا سے کیا بنا دیا ہے۔

سلیم کے نام خطوط

قوموں کی تقدیر ان کی ابھرنے والی نسلوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے جس قسم کے سانچوں میں ان کے قلب و دماغ کو ڈھالا جائیگا اسی قسم

کا اس قوم کا مستقبل ہوگا۔ جو قوم اپنے بچّوں کو سنبھال لے اور ان کی تعلیم و تربیت صحیح طریقہ سے کرے تو دنیا دیکھے گی کہ ان نوجوانوں کے قلب و دماغ کی صلاحیتیں، ان کے خون گرم کی حرارتیں، ان کے زور بازو، ان کا جوشِ کردار کس طرح ایک کف بردہان سیلاب کی طرح اٹھتا اور ٹکراتے والی قوت کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جاتا ہے۔ قوموں کی قسمتوں کے فیصلے بساطِ سیاست یا میدانِ جنگ میں نہیں ہوتے یہ فیصلے ان کے مکتبوں اور تربیت گاہوں میں ہوتے ہیں۔

اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی
ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد

یہ ہے وہ حقیقت جس کے پیشِ نظر محترم پرویز صاحب نے ابتدا ہی سے اپنی قرآنی بصیرت کا مخاطب قوم کے نوجوان طبقہ کو سمجھا۔ نوجوانوں کے کردار کو قرآن کریم کے قالب میں ڈھالنے کے لئے محترم پرویز صاحب نے سلیم کے نام خطوط کا آغاز ۱۹۳۹ء سے کیا۔ موصوف کا نوجوانوں سے خطاب کا یہ دلنشین اسلوب تریاق ثابت ہوا۔ مذہب سے برگشتہ ہزاروں نوجوان اپنے قلبی اضطرابات، ذہنی تشکیک، دل و دماغ میں سرکشی کے ہزاروں شعلے لئے ان کی بارگاہ تک پہنچے اور ان کے تشکیک و شبہات، یقین و اطمینان اور ان کی سرکشی کے جذبات قرآن کی عظمت کے اعتراف سے بدل گئے، یہ خطوط ماہنامہ طلوع اسلام کی دسمبر، نومبر ۱۹۳۹ - مارچ، جولائی، اکتوبر ۱۹۴۰ء - جنوری، مئی اور ستمبر ۱۹۴۱ء کی اشاعتوں میں رونق اوراق بنے پاکستان کی تشکیل کے بعد بھی محترم پرویز صاحب نے یہ سلسلہ جاری رکھا۔ جو "سلیم کے نام خطوط" کی حیثیت سے تین جلدوں میں شائع ہوئے ان کا تذکرہ محترم پرویز صاحب کی دیگر تصانیف کے تعارف میں آپ کے سامنے آئے گا۔

یومِ نجات

۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے ماتحت کانگریس نے ہندو اکثریت کے صوبوں میں زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور اڑھائی سال تک مسلمان اقلیت پر جس جس انداز سے مظالم توڑے ان کی یاد آج بھی ہر قلب احساس کو تڑپا کر رکھ دیتی ہے۔ خدا خدا کر کے اس دور استبداد کا خاتمہ ہوا۔ جب کانگرسی وزراء نے اپنے عہدوں سے استعفے دیدیے تو اس بلائے عظیم سے نجات پر مسلم لیگ نے "یوم نجات منایا"۔ اس سلسلہ میں طلوع اسلام نے بھی ایک جامع پمفلٹ شائع کیا اور بتایا کہ مسلمان کے یہ سجدہ ہائے تشکر و نجات اس لئے ہیں کہ مسلمان دنیا میں نہ انگریز کا غلام رہ کر جی سکتا ہے نہ ہندو کا۔ یہ صرف اپنے اللہ کا غلام اور اس کے آئین کا محکوم بن کر ہی بحیثیت مسلمان زندگی بسر کر سکتا ہے۔ جنوری ۱۹۴۰ء کے طلوع اسلام میں "یوم نجات" کے عنوان سے یہ مضمون منظر عام پر آیا۔

نیشنلسٹ علماء

جنوری ۱۹۴۰ء کے طلوع اسلام میں "نیشنلسٹ علماء" کے عنوان سے ایک مبسوط مضمون کی پہلی قسط شائع ہوئی۔ جو نیشنلسٹ علماء کے سامنے ان کی صحیح تصویر پیش کرنے کی ایک مؤثر اور جاذب کوشش تھی۔

تمسک بالکتاب جنوری ۱۹۴۰ء کے طلوع اسلام میں محترم پرویز صاحب کا مضمون "تمسک بالکتاب" شائع ہوا جس میں بتایا گیا کہ جس طرح مسلمانوں کی تمام حرکت وعمل کا مرکز کعبہ ہے اسی طرح ان کے آئین وضوابط کا مرکز قرآن ہے۔ مسلمانوں نے جب تک اس آئین وضوابط کے تابع زندگی بسر کی، دنیا کی ممتاز ترین قوم میں ان کا شمار ہوا اور جب انہوں نے انسانوں کے بنائے ہوئے دساتیر سے تمسک قائم کیا تو وہ کس طرح زوال پذیر ہو کر دنیا کی پست ترین قوم بن کر رہ گئے۔

سپاسنامہ مسلم لیگ کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز ۱۹۳۸ سے ہوا۔ دو سال کے عرصہ میں ملت اسلامیہ کے اس اہم "مقدمہ" کے وکیل نے اس کے اصول ومبادیات کی تشریح وتوضیح میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ مسلمان ایک جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ مسلم لیگ اس قوم کی واحد نمائندہ جماعت ہے، یہ تھے وہ بنیادی اصول جو اس دو سال کے عرصہ میں بدلائل منیرہ دنیا کی عدالت میں بار بار پیش ہوئے۔ اب وقت آگیا تھا کہ اس قوم کے اصل دعوے کو واضح الفاظ میں سامنے لایا جائے اس مقصد کے لئے مارچ ۱۹۴۰ء میں لاہور میں مسلم لیگ کا وہ معرکہ آراء اجلاس منعقد ہوا جس نے نہ صرف ملت اسلامیہ کی تقدیر بدل دی بلکہ دنیا کے نقشہ میں ایک اہم تبدیلی پیدا کر دی۔ اس تقریب پر ملت اسلامیہ کی کشتی کے ناخدا قائد اعظمؒ محمد علی جناح کی خدمت میں محترم پرویز صاحب نے ادارہ طلوع اسلام کی طرف سے ایک تاریخی سپاسنامہ پیش کیا جو درحقیقت پوری قوم کی طرف سے سپاسنامہ تھا۔

جناب آزاد کے خطبۂ صدارت پر تبصرہ مارچ ۱۹۴۰ء میں ادھر یہ اجلاس ہو رہا تھا اور ادھر رام گڑھ کے مقام پر کانگریس کے سالانہ اجلاس کی کرسئ صدارت سے راشٹر پتی ابوالکلام صاحب آزادؔ اعلان فرما رہے تھے کہ مسلمانوں کا دعوائے آزادی غلط اور گمراہ کن ہے انہیں ہندوؤں کا غلام بن کر جینا ہوگا کہ یہی اسلام کی تعلیم ہے یہی قرآن کا ارشاد ہے۔ ادھر یہ دونوں اجتماعات لاہور اور رام گڑھ میں انعقاد پذیر تھے اور ادھر جبریل اور ابلیس میں آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارے ہو رہے تھے۔ زمین اس بدبختی پہ روتی تھی اور تقدیر اس پر ہنستی تھی۔ اپریل ۱۹۴۰ء کے طلوع اسلام میں جناب آزاد کے خطبۂ صدارت پر ادارہ کا ایک تبصرہ شائع ہوا جس میں انہیں بتایا گیا کہ ان کا آج کا قرآن ان کے تیس برس پیشتر کے قرآن سے کس قدر مختلف تھا۔

شخصیت پرستی مارچ، اپریل، مئی ۱۹۴۰ء کے طلوع اسلام میں محترم پرویز صاحب کا ایک بصیرت افروز مقالہ "شخصیت پرستی" رونق وہ اوراق ہوا جس میں قرآن وسنت کی روشنی میں شخصیت پرستی پر روشنی ڈالتے ہوئے رسول پرستی۔ ائمہ پرستی۔ اسلاف پرستی۔ رواۃ پرستی، مردہ پرستی اور ماضی پرستی پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے بتایا گیا کہ

شخصیت کو ان تخیلات سے مبرا رکھا جائے

یہ کہ انسانی تخیلات کن کن لطیف راہوں سے قرآن پر اثر انداز ہوتے ہیں اور یہ کہ انہوں نے عقیدت اور عظمت کی مقدس نقاب اوڑھ کر کس طرح مسلمانوں کے دل کی گہرائیوں میں جگہ پکڑ رکھی ہے۔

جہانِ نو

جب ملّت اسلامیہ کے اجتماع لاہور نے اپنے مطالبہ کو واضح طور متعین کر کے اعلان کر دیا تو ضرورت تھی کہ اس مطالبہ کے مختلف گوشوں پر سیر حاصل بحث کی جائے اور اس کا تفصیلی جائزہ لے کر اپنوں اور بیگانوں کو بتا دیا جائے کہ یہ مطالبہ کیا ہے؟ کس لئے کیا گیا ہے؟ اور اس کے حصول کا طریق کیا ہوگا۔ اس کے لئے جون ۱۹۴۰ء کے رسالہ طلوع اسلام میں محترم پرویز صاحب کے اسّی صفحات پر مشتمل ایک جامع مضمون بہ عنوان "جہانِ نو" شائع ہوا۔ جس نے فی الواقع دنیا کو ایک جہانِ نو متعارف کرایا۔ اس سے پیشتر بہت کم لوگوں کو اس کا علم تھا کہ مسلمان اس مطالبہ پہ کیوں مجبور ہے۔ اس سے حقیقی مقصد کیا ہے۔ اور یہ کہ اس جہانِ نو کے قیام سے کس طرح اس دنیائے کہن کا جہنم، امن و سلامتی کی جنت میں تبدیل ہو جائے گا۔ اس مضمون کو علیحدہ پمفلٹ کی شکل میں بھی شائع کیا گیا اور بعد میں اس پمفلٹ کے کئی ایڈیشن بھی شائع ہوئے۔

ختمِ نبوّت

جیسا کہ اس سے پہلے صفحات میں یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ مقام نبوت پر محترم پرویز صاحب اپنے ایک مضمون "میکانکی اسلام" میں لکھ چکے تھے اور بہاولنگر کی عدالت کے ڈسٹرکٹ جج محمد اکبر (مرحوم) نے اپنے فیصلہ میں اس کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا تھا کہ غلام احمد پرویز نے اپنے مضمون میں نبوت کی جو حقیقت بیان کی ہے میری رائے میں اس سے بہتر اور کوئی بیان نہیں کی جا سکتی۔ چنانچہ اگست ۱۹۴۰ء کے شمارہ میں محترم پرویز صاحب کا ایک اور مضمون بہ عنوان "ختم نبوت" منظرِ عام پر آیا جس میں نبی اور نبوت کی عظمت اور مقام کی تشریح کے علاوہ وضاحت سے بتایا گیا کہ "ایک آنے والے" کے مجوسی عقیدہ کی حقیقت کیا ہے اور اس عقیدہ نے کس طرح دعویٰ نبوت کے دروازہ کو کھول کر رکھ دیا ہے۔

لیلۃ القدر

نومبر ۱۹۴۰ء کے طلوع اسلام میں محترم پرویز صاحب کا ایک مضمون "لیلۃ القدر" کے عنوان سے شائع ہوا جس میں انہوں نے بتایا کہ لیلۃ القدر تاریکی سے روشنی کی طرف، راہنمائی کا نام ہے۔ یہی وہ دور تھا جب حیاتِ انسانی کے ہر شعبے پر بربریّت چھا چکی تھی اور زندگی کی تاریک رات میں امید کی کوئی کرن نظر نہ آتی تھی اسی دور میں قرآنِ کریم کی روشنی سے تاریکیاں چھٹنی شروع ہوئیں اس لئے مسلمانوں کے نزدیک یہ قرآنی جشنِ مسرت کی تقریب ہے۔
آج دنیا دل کے اضطراب اور روح کی پریشانی کے جس جہنم سے گذر رہی ہے، ضرورت تھی کہ جس قوم کو یہ سراج منیر عطا ہوا تھا، وہ انسانیت کو ان اندھیروں سے نکالنے کے لئے ان کے راستے روشن کر لیتی۔ راستہ دکھانے والا جب چراغِ ہدایت کو دامن میں چھپالے تو منزل پر کیسے پہنچا جائے۔
ہم مسلمانوں نے جب پھر سے ایک مرتبہ قرآن کریم کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا تو یہ دنیا

ان کے لئے امن وسلامتی کا گہوارہ بن جائے گی اس وقت ہمیں معلوم ہوگا کہ لیلۃ القدر کی صحیح عظمت کیا ہے

پاپولر

فروری ۱۹۸۱ء میں محترم پرویز صاحب کا ایک مقالہ "پاپولر" شائع ہوا جس میں موصوف نے پاپولر ہونے کے لئے نہایت آسان لائحہ عمل کی یہ توضیح فرمائی :۔

اصول ہوں یا فروع نقطہ پیش نظر رہے کہ جو کچھ آپ ہیں وہ ظاہر نہ ہونے پائے جو ظاہر ہوں وہ حقیقت نہ ہو۔ جو محسوس کریں وہ کہیں نہیں اور جو کہیں وہ محسوس نہ کر رہے ہوں۔ قلب اور زبان میں ہم آہنگی کبھی نہ ہو اور اس روش کا نام: پالیٹکس یا مصلحت رکھ لیں۔ پس پاپولر ہونے کی سکیم کا کامیاب ہونا یقینی ہے اور یہ آخری ڈگری ہے جو میکیاولی سیاست کی اخلاقی یونیورسٹی سے آپ کو مل سکتی ہے لیکن قرآن کا (VERDICT) اس کے بالکل متضاد ہے۔ ۲/۶۱ اے ایمان والو ایسی بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں، خدا کے نزدیک یہ بہت ناپسندیدہ ہے کہ تمہارا قول وفعل یکساں نہ ہو۔

اسلام اور سائنس

عجمی تصوف کے ترکِ دنیا کے فلسفہ نے جب مسلمانوں کو زندہ اور زندگی بخش دنیا کو قبرستان میں تبدیل کر دیا۔ تو نہ ان کے ذہنوں میں ندرتِ افکار رہی نہ بازوؤں میں قوتِ تخلیق۔ دماغ تقلید جامد کی برفانی سلوں سے مفلوج ہو گئے اور وہ آہنی پنجے جو پتھروں کے سینہ میں چھپی ہوئی چنگاریوں کو کھینچ کر اپنے قبضۂ قدرت میں لے آیا کرتے تھے، مصروفِ تسبیح شماری ہو گئے۔ رفتہ رفتہ ان کی یہ حالت ہو گئی کہ دنیا اور اس سے متعلق تمام علوم وفنون کفار کا حصہ قرار پا گئے اور محکومی ومحتاجی کی ذلت آمیز زندگی کو "اللہ کی رحمت" قرار دے کر مسلمانوں نے اپنے آپ کو مطمئن کر لیا کہ آخرت کی تمام سرفرازیاں انہی کا حصہ ہیں۔ اس عجمی افسوں کے اثرات کو زائل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ مسلمانوں کے سامنے اس حقیقت کو واضح کیا جائے کہ قرآن نے علوم طبعی میں غور وفکر کرنے اور اشیائے کائنات کو مسخر کر کے نفع اندوزی کی کس قدر تاکید کی ہے اور جب قرآن کریم کی صحیح تعلیم مسلمانوں کے سامنے تھی تو اس باب میں انہوں نے کس قدر تجسس وکاوش سے کام لیا تھا۔ اس موضوع پر محترم پرویز صاحب کا تحقیقاتی مقالہ "اسلام اور سائنس" مارچ ۱۹۸۱ء کے طلوع اسلام میں زینت اوراق بنا۔

فردوس گم گشتہ

اپریل ۱۹۸۱ء میں محترم پرویز صاحب کا ایک اور مضمون بعنوان "فردوسِ گم گشتہ"، شائع ہوا جس میں انہوں نے بتایا کہ وہ جنت ارضی جس کے ہم کبھی وارث تھے کس طرح ہماری نگاہوں سے گم ہو گئی اور اب اس کی بازیابی کی کیا صورت ہے۔

نظام جدید

اس مقصد کے لئے قرآن کریم سے تمسک اور جماعتی زندگی کا اجیا نہایت ضروری ہے کہ

ملت کیساتھ رابطہ استوار رکھ پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

چونکہ عدالتِ خداوندی کے منبر پر آج قرآن کے علاوہ کوئی ضابطہ نہیں جس کے مطابق اقوامِ عالم کی موت و حیات کے فیصلے ہوتے ہوں ؎

صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست ! عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست

ایمان بلا عمل

محترم پرویز صاحب کا مضمون "ایمان بلا عمل" جولائی ۱۹۸۱ء کے طلوع اسلام میں شائع ہوا جس میں بتایا گیا کہ قرآن کریم کی رُو سے جس طرح وہ اعمالِ زندگی جن کی بنیادیں ایمان پر نہیں ہوتیں، ایسی بجلیاں بن جاتے ہیں جو انسانیت کے امن و سلامتی کے خرمنوں کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیتی ہیں، اسی طرح وہ ایمان جو خالی الفاظ کا مجموعہ سمجھ لیا جائے اور جس کی تصدیق اعمالِ حیات نہ کریں، برف کا ایسا تودہ بن جاتا ہے جو رگوں میں دوڑنے والے خونِ گرم کے ہر قطرہ کو منجمد کر کے رکھ دیتا ہے۔ موصوف نے لکھا وہ قول، وہ زبانی دعویٰ وہ اقرار۔ وہ اصطلاحی ایمان جس کی تائید اعمال سے نہیں ہوتی، جس کی تصدیق آپ کے قلوب اور جوارح نہیں کرتے، قرآن کی میزان میں پرِ کاہ کے برابر بھی وزن نہیں رکھتا بلکہ ایسا زبانی دعویٰ ایک جرمِ عظیم ہے۔

کیا تمام مذاہب یکساں ہیں

(مولانا) ابوالکلام آزاد نے اپنی برہمو سماجی تفسیر (ترجمان القرآن) میں ہندو مذہب اور مذہب اسلام کو ترازو کے دو پلڑوں میں رکھ کر برابر ثابت کرنے کی جو مکروہ کوشش کی اس نے گاندھی کو یہ پروپیگنڈہ کرنے کا موقع فراہم کر دیا کہ تمام مذاہب یکساں ہیں۔ یہ خطرہ بہت دور رس تھا اس لئے بھی کہ جناب آزاد مسلمانوں میں ایک عالمِ قرآن کی حیثیت سے متعارف ہو چکے تھے اور ان کے الفاظ کا جادو مسلّم تھا۔ اس سحرِ ساحری کو توڑنے کے لئے محترم پرویز صاحب کا مدلل اور مسکت مضمون "کیا تمام مذاہب یکساں ہیں؟" اگست ۱۹۸۱ء کے پرچہ میں شائع ہوا جس نے اس طلسم تارِ عنکبوت کو تار تار کر کے رکھ دیا۔

نجات کا قرآنی نظریہ!

اکتوبر ۱۹۸۱ء کے طلوع اسلام میں محترم پرویز صاحب کا ایک مقالہ بہ عنوان "نجات کا قرآنی نظریہ"، زینتِ اوراق بنا۔ جس میں بتایا گیا کہ دنیا کے مذاہب میں انسانی زندگی کی تمام تگ و تاز کا منتہیٰ یہ ہے کہ کسی طرح نجات حاصل ہو جائے یعنی انسان جیسا تھا پھر ویسا ہی بن جائے۔ ہمارے ہاں شریعت اور طریقت دونوں میں نجات کا تصوّر دوسروں سے مستعار لیا گیا ہے اس تصوّر کو قرآن سے کچھ تعلق نہیں۔ قرآن کی رو سے زندگی کا مقصود کسی مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنا (نجات) نہیں بلکہ اپنی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما سے بلند مقامات کا حصول (ATTAINMENT) ہے یعنی تخم حیات کی آبیاری اور پرورش سے اسے ایک تند و مند و توانا شجرِ طیّب میں تبدیل کر دینا۔ اسی لئے قرآن نے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ یاد رکھو قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا جس نے تخم حیات کو نشوونما دی، اس کی کھیتی بار آور ہوئی۔ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (۹۱/۹-۱۰) جس نے اس بیج کو مٹی کے تودوں کے نیچے دبا دیا اس کی کھیتی کا ثمر بار ہونا تو ایک طرف خود بیج بھی ضائع ہو گیا۔

نظریۂ ارتقاء اور قرآن کریم

دسمبر ۱۹۴۱ء کے رسالہ طلوع اسلام میں شائع شدہ مضمون نظریۂ ارتقاء اور قرآن کریم میں محترم پرویز صاحب نے تاریخ عالم کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا کہ قرآن سے پہلے دنیا، بالواسطہ یا بلا واسطہ، مفکرین یونان کے نتائج فکر سے متاثر تھی اس فلسفے کی رو سے کائنات کا تصور سکونی (STATIC) تھا۔ قرآن کریم نے اس نظریہ کا ابطال کیا اور کہا کہ کائنات کا تصور سکونی نہیں بلکہ حرکانی (DYNAMIC) ہے۔ ہیولائے کائنات ایک بننے والی شے کے خمیر کی شکل میں وجود میں آیا اور اب کائنات مسلسل تغیر و تبدل سے اپنی ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی اپنے منتہیٰ کی طرف بڑھ رہی ہے۔ خالق کائنات اس ہیولہ کو وجود میں لانے کے بعد معطل ہو کر نہیں بیٹھ گیا بلکہ وہ اس میں نت نئے اضافے کرتا رہتا ہے یَزِیْدُ فِی الْخَلْقِ مَا یَشَآءُ (۳۵/۱) وہ اپنے قانونِ مشیت کے مطابق، مخلوق میں نت نئے اضافے کرتا رہتا ہے۔ صرف اضافہ ہی نہیں بلکہ ایسا تغیر و تبدل کہ ہر وہ شے جو قائم یا زندہ رہنے کے قابل نہیں رہتی اسے مٹا دیا جاتا ہے اور جس میں زندہ رہنے یا باقی رہنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیت ہوتی ہے اسے مستحکم کر دیا جاتا ہے۔ یَمْحُوا اللّٰہُ مَا یَشَآءُ وَ یُثْبِتُ (۱۳/۳۸)

معارف القرآن جلد اول

اس مقام پر اسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی کا ذکر ضروری ہے اور وہ یہ کہ پرویز صاحب کے جن مضامین کا ذکر اوپر آچکا ہے درحقیقت یہ ان کے تدبر فی القرآن کے منتشر اجزاء تھے حقیقت یہ ہے کہ ان مضامین میں سے ایک ایک مضمون اپنی جگہ ایک کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ موصوف کے اس تدبر و تفکر کی مستقل صورت وہ عظیم القدر کتاب ہے جو معارف القرآن کے نام سے وجہ فروغ ابصار ہوئی۔ اس کتاب کی پہلی جلد جو "اللہ" کے عنوان سے شائع ہوئی، کی اشاعت کا فخر طلوع اسلام کو حاصل تھا۔ یہ ۱۹۴۱ء میں منصۂ شہود پر آئی۔ اس کے متعلق صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہوگا کہ قرآن کریم کی صحیح تعلیم کو سمجھنے کے لئے دنیا کی کسی زبان میں اس کتاب کی نظیر نہیں مل سکے گی۔ خدا کا صحیح تصور کیا ہے انسان کا اس کے ساتھ تعلق کیا؟ تاریخی شواہد نے انسان کو اس مقام پر لا کھڑا کیا ہے جہاں وہ یہ کہنے پر مجبور ہے کہ جس قسم کا کسی قوم کا خدا کا تصور، اسی قسم کی اس قوم کی ذہنی اور تمدنی حالت۔ خدا کا صحیح تصور ہمیں قرآن کریم ہی سے ملتا ہے کیونکہ اپنے متعلق صحیح تصور خود خدا ہی دے سکتا ہے۔ خدا کا قرآنی تصور پرویز صاحب نے سلسلۂ معارف القرآن کی اس پہلی جلد میں اپنے مخصوص دلکش اور دلنشین انداز میں پیش کیا ہے جو پاکستان میں "من و یزداں" کے نام سے دوبارہ شائع ہوئی

دنیا کی نجات

دنیا کی نجات کے عنوان سے محترم پرویز صاحب کا ایک مقالہ جنوری ۱۹۴۲ء کے طلوعِ اسلام میں جلوہ ریز ہوا۔ جس میں اقوام عالم کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے کہ دنیا کی موجودہ مشکلات و مصائب مغربی نظام تمدن کے ثمرات ہیں۔ عہد حاضر کے نظام زندگی کے ستائے ہوئے انسان کو جس چشمۂ سکون و راحت کی تلاش ہے۔

ہر چند کہ وہ اس کا پتہ پریشان الفاظ اور بکھرے ہوئے نشانات سے دے رہا ہے۔ لیکن کوئی متعین اور واضح نشانِ منزل ان کے سامنے نہیں۔ اسلامی نظام حیات کے بنیادی خط و خال کا خاکہ پیش کرتے ہوئے موصوف نے لکھا کہ اسلام میں نظام زندگی کی بنیاد عقیدۂ توحید پر ہے۔ توحید سے مفہوم یہ ہے کہ حاکمیت کا حق صرف خدا کو حاصل ہے یعنی انسان کو خواہ وہ ایک فرد ہو یا افراد کا مجموعہ، دوسرے انسانوں پر حکومت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔
وحدتِ خلق یعنی یہ عقیدہ کہ دنیا میں تمام انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں نسل یا ملک کی تقسیم سے انسانیت کی تقسیم نہیں ہو سکتی اسی ایک عقیدہ سے وہ تمام اقتصادی، سیاسی، معاشرتی، عمرانی مسائل خود بخود حل ہو جاتے ہیں جو آج انسان کے گرد مار پیچاں کی طرح لپٹے ہوئے ہیں اور اس کی زندگی کو جہنم بنا رہے ہیں۔ دنیا کی نجات کا واحد حل قرآنی نظام حیات کا نفاذ ہے اور بس۔

عیدالاضحیٰ

جنوری ۱۹۴۲ء میں محترم پرویز صاحب کا ایک اور مضمون "عیدالاضحیٰ" کے عنوان سے طلوع اسلام میں شائع ہوا جس میں بتایا گیا کہ مذہب کے متعلق عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ ایک فرد کی ذاتی اصلاح کا ذریعہ ہے اس میں شبہ نہیں کہ افراد کی ذاتی اصلاح نہایت ضروری ہے لیکن یہ اصلاح اصل مقصد نہیں۔ اسلام افراد کی اصلاح سے ایک ایسی جماعت پیدا کرنا چاہتا ہے جو نظام انسانیت کو عدل پر چلا سکے اس مقصد کے حصول کے لئے اس نے ایک ایسا عملی پروگرام مرتب کر دیا ہے جس میں ہر قدم اسی منزل کی طرف اٹھتا ہے نماز کے اجتماعات، تقویٰ، ضبطِ نفس، غیر اللہ کی محکومی سے انکار، اللہ کی حاکمیت کا اقرار، مرکزیت، اجتماعیت اور اطاعت کے امام عملی مظاہر ہیں۔ جمعہ کے اجتماع میں یہ دائرہ وسیع تر ہو جاتا ہے۔ عید کی تقریب پر اس کی حدود اور زیادہ وسیع ہو جاتی ہیں اور بالآخر عیدالفطر کے اجتماع میں ہر مقام سے ملتِ اسلامیہ کی نمائندگی کے لئے افراد اپنی بین المملکتی کانفرنس میں شرکت کی غرض سے ایک مرکز بیت الحرام میں جمع ہو جاتے ہیں اور نوع انسانی کی بھلائی کے لئے غور و فکر کرتے ہیں۔

اپنی آنکھ اور قرآن کریم کی روشنی

اپریل مئی ۱۹۴۲ء کا مشترک شمارہ شائع ہوا جس میں محترم پرویز صاحب کا مقالہ "اپنی آنکھ اور قرآن کریم کی روشنی" زینت دہ اوراق ہوا جس میں بتایا گیا کہ پہلی امتوں میں ہوتا یہ آیا تھا کہ کچھ عرصہ تک لوگ اپنے رسول کے لائے ہوئے پیغام کی اتباع کرتے اسکے بعد جب نفسیاتی خواہشات اور اقتدار کے حصول کا جذبہ ان پر غالب آ جاتا تو وہ رفتہ رفتہ دوسری شاہراہوں پر چل نکلتے۔ شروع میں یہ روش بالارادہ ہوتی لیکن اس کے بعد آنے والی نسلیں غیر شعوری طور پر اپنے آباؤ اجداد کے وراثتی اثرات کے ماتحت اس غیر فطری مسلک کو اختیار کئے

رکھتیں ۔ اس کے بعد ایک اور رسول آجاتا جو پھر سے خداوندی کو نافذ کرتا اور تجدید دعوت کرتا ۔ نبی آخرالزماں کے بعد کسی رسول کی ضرورت باقی نہیں رہی اس لئے کہ خدا کا آخری پیغام اپنی اصلی شکل میں موجود رہنے کا ذمہ خدا نے خود لے لیا ۔ قرآن کریم کی حفاظت کا ذمہ لینے کا مطلب یہ نہیں کہ جس طرح پہلی امتیں راہ راست کو چھوڑ کر آہستہ آہستہ وراثتی اثرات کے ماتحت غلط راستے پر چل نکلیں، یہ قوم غلط روش اختیار نہیں کرے گی ۔ غلط روش اختیار کرنے کے لئے سینکڑوں محرکات اور ہزاروں اسباب پیدا ہو جاتے ہیں اس روش سے حفاظت کا ایک ہی طریق ہے کہ انسان اپنے ہر ایک قدم کا جائزہ پیغام خداوندی کی روشنی میں لیتا رہے اور جونہی کوئی قدم غلط اٹھنے لگے قرآن کی صراط مستقیم پر لے جائے ۔ موصوف نے لکھا کہ قرآن کریم کی اتباع میں اگر کسی بڑے سے بڑے بزرگ کا اپنا خیال بھی ترک کر دینا پڑے تو اس میں ذرا تامل نہیں ہونا چاہیئے اس لئے کہ حق کو کبھی انسانوں کے ذاتی خیالات کے تابع نہیں ہونا چاہیئے ۔ جب ایسا ہوتا ہے تو کوئی شے اپنی اصل پر قائم نہیں رہتی ۔ آج ہم جادۂ اعتدال سے اس لئے ہٹے ہوئے ہیں کہ ہم نے حق کو انسانوں کی آراء کے تابع چھوڑ رکھا ہے ۔

حدیث کے متعلق میرا مسلک

جون ۴۲ ۱۹ء کے طلوع اسلام میں محترم پرویز صاحب نے حدیث کے متعلق اپنا مسلک بیان کرتے ہوئے بتایا کہ نبی اکرمؐ کی سیرت مقدسہ، شرفِ انسانیت کی معراجِ کبریٰ کی مظہر تھی لیکن بدقسمتی سے ہماری کتب روایات و تاریخ میں ایسی باتیں شامل ہو گئیں ہیں جن سے حضورؐ کی سیرت داغدار ہو کر سامنے آتی ہے ۔ آپؐ کی سیرت طیبہ کا جو حصہ قرآن کے اندر محفوظ ہے اس کے قطعی اور یقینی ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں باقی رہا وہ حصہ جو قرآن سے باہر ہے، سو اس میں اگر کوئی بات ایسی ہے جو قرآن کے خلاف جاتی ہے یا جس سے حضورؐ پر کسی قسم کا طعن پایا جاتا ہے تو وہ بات ہمارے نزدیک وضعی ہے اور حضورؐ کی طرف غلط منسوب ۔ ضرورت ہے کہ سیرت نبوی کے صحن چمن سے ان کانٹوں کو الگ کر دیا جائے جو روایات نہ قرآن کے خلاف ہیں اور نہ ہی ان سے حضورؐ کی سیرتِ مقدسہ پر کسی قسم کا حرف آتا ہے انہیں ہم صحیح مانتے ہیں

سیاسی میدان میں قائداعظم کی وکالت اور فراستِ ایمانی ۔ مذہبی محاذ پر طلوع اسلام کے جہاد نے انگریز اور ہندو کو سوچنے پر مجبور کر دیا ۔ نظریۂ پاکستان کی تائید میں اِدھر اُدھر سے

(محترم پرویز صاحب نے احادیث نبویؐ کے متعلق اپنے مسلک کی وضاحت متعدد مقامات پر کی ہے ان کی کتاب مقامِ حدیث میں اس کے متعلق تفصیلی مباحث موجود ہیں جو آئندہ کسی اشاعت میں آپ کے سامنے آئیں گے)

محترم پرویز صاحب نے اس عرصہ میں علامہ اقبالؒ کے پیام کی بھی بھرپور اشاعت کی تقریباً ہر ماہ کے رسالہ میں مقام اقبالؒ ۔ پیام اقبالؒ ۔ اقبالؒ اور قرآن ۔ اقبالؒ اور ملت ۔ اقبال کے تصورِ خودی کے موضوعات پر ان کے مقالات

آوازیں اٹھنی شروع ہوئیں۔ اوائل ۱۹۴۲ء میں راجگوپال اچاریہ نے اپنا وہ فارمولا پیش کیا جس میں فی الجملہ اس نظریہ کو صحیح تسلیم کیا گیا تھا پھر سر سٹیفورڈ کرپس آئے تو انہوں نے بھی اپنی تجاویز میں اس کی طرف رجحان ظاہر کیا۔ لیکن ان چیزوں سے صرف ہوا کا رخ تبدیل ہوا تھا۔ کشتی ملت کو ساحل مقصود تک پہنچنے کے لئے ابھی اور فاصلہ طے کرنا تھا اس کے لئے ابھی اور جدوجہد اور کاوش کی ضرورت تھی یہ ہنگامہ اسی طرح جاری تھا کہ جنگ کی وجہ سے پیدا شدہ نامساعد حالات ہجوم کر کے امنڈ آئے اور جولائی ۱۹۴۲ء سے طلوع اسلام کی اشاعت کا سلسلہ بصد مجبوری التوا میں پڑ گیا۔

جسطرح طلوع اسلام اور محترم پرویز صاحب لازم و ملزوم ہیں اسی طرح تحریک پاکستان اور طلوع اسلام کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ طلوع اسلام ایک خالص فکری تحریک ہے یہ عملی سیاست میں بھی کوئی حصہ نہیں لیتا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اس نے ہر سیاسی مسلک کا قرآن کریم کی روشنی میں جائزہ لیا لیکن اپنی کوئی سیاسی پارٹی نہیں بنائی اس نے مروجہ اسلام کے ہر گوشے کو قرآن کی روشنی میں جانچا اور پرکھا ہے لیکن کوئی نیا فرقہ پیدا نہیں کیا۔ وہ پارٹی بازی اور فرقہ سازی کو قرآن کریم کی نص صریح کی رو سے شرک سمجھتا ہے اس کے نزدیک مسلمان اپنی آئیڈیالوجی کی بنا پر تمام غیر مسلموں کے مقابلہ میں ایک منفرد پارٹی (امت) ہے اور امت کے اندر پارٹی یا فرقہ دین کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیتا ہے۔

بایں ہمہ محترم پرویز صاحب نے قارئین طلوع اسلام کو ہند کی اس دور کی سیاست سے باخبر رکھا ہے اور اس دور کے ہر سیاسی موڑ پر قرآن کریم کی روشنی میں جائزہ لے کر انگریز، ہندو اور نیشلسٹ مسلمانوں کی چالوں کو بے نقاب کیا ہے۔ برصغیر ہند میں جولائی ۱۹۴۲ء سے اگست ۱۹۴۷ء تک جو واقعات رونما ہوئے تسلسل فکر و نظر کے لئے طلوع اسلام نے انہیں اپنے صفحات پر نقش کیا ہوا ہے۔

۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۷ء تک محترم پرویز صاحب معارف القرآن اور تبویب القرآن کی ترتیب و تدوین کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ معارف القرآن جلد دوم اور جلد سوم ۱۹۴۵ء میں شائع ہوئیں معارف القرآن جلد دوم کا عنوان "ابلیس و آدم" تھا۔ اس کتاب میں جن موضوعات پر فاضلانہ بحث کی گئی ہے ان میں انسان کی پیدائش۔ نظریہ ارتقاء۔ قوموں کے عروج و زوال کے اصول۔ تحفظ نفس، تحفظ ذات، اختیار و ارادہ کی سحر کاریاں۔ رہبانیت و خانقاہیت، ابلیس شیطان۔ ملائکہ جن بھوت، روح۔ وحی کی ماہیت۔ وجدان کشف و الہام کی حقیقت۔ وحدت حیات اور وحدت انسانی۔ رسالت نبوت۔ اطاعت رسول۔ مذاہب عالم کی باہمی رقابت۔ انفرادی ملکیت کا تصور۔ فرقہ بندی۔ حکومت الٰہیہ کا مفہوم اور کئی دوسرے عنوانات شامل ہیں اس کتاب کے مطالعہ سے محترم پرویز صاحب کی قرآن کریم پر گہری نظر۔ قدیم و جدید علوم پر ان کی گرفت۔ اسلوب بیان اور عرق ریزی کا بھرپور اندازہ ہوتا ہے۔

معارف القرآن جلد سوم کا عنوان "تاریخ رسالت" ہے جس میں حضرت ابراہیمؑ۔ حضرت اسمٰعیلؑ۔ حضرت اسحٰقؑ۔ حضرت یعقوبؑ۔ حضرت لوطؑ۔ حضرت یوسفؑ۔ حضرت شعیبؑ۔ حضرت موسٰیؑ داستان بنی اسرائیل۔ تورات۔ حضرت داؤدؑ۔ حضرت سلیمانؑ۔ حضرت ایوبؑ۔ حضرت یونسؑ۔ ذوالقرنین۔ حضرت ذکریاؑ۔ حضرت یحیٰؑ۔ حضرت عیسٰیؑ۔ اصحاب کہف۔ یعنی انبیائے سابقہ کی انقلاب انگیز دعوت توحید اور اقوام ملل گذشتہ کی عبرت آموز و بصیرت افروز داستان عروج و زوال شامل ہے۔ ۷۹۶ صفحات پر نقش یہ کتاب محترم پرویز صاحب کی برسہا برس کی دیدہ ریزی اور کاوشوں کا منہ بولتا نوشتہ ہے۔

معارف القرآن جلد اوّل جس کا عنوان "اللہ" تھا تشکیل پاکستان کے بعد من و یزداں کے نام سے شائع ہوئی۔ دوسری جلد پاکستان میں ابلیس و آدم ہی کے عنوان سے شائع ہوئی۔ معارف القرآن کی تیسری جلد پاکستان میں تین حصوں میں شائع ہوئی جو جوئے نور۔ برق طور اور شعلۂ مستور کے عنوانات سے منظر عام پر آئی۔

معارف القرآن کی جلدوں کے متعلق اکثر قارئین کو کچھ مغالطہ ہو جاتا ہے ان کی تفصیل اس طرح ہے۔

★ معارف القرآن جلد اوّل جس کا عنوان "اللہ" تھا اور جو پاکستان میں "من و یزداں" کے نام سے شائع ہوئی

★ معارف القرآن جلد دوم جو تقسیم سے قبل اور تقسیم کے بعد "ابلیس و آدم" کے نام سے شائع ہوئی۔

★ معارف القرآن جلد سوم جو تقسیم سے قبل "تاریخ رسالت" کے عنوان سے شائع ہوئی اور پاکستان میں جوئے نور۔ برق طور اور شعلۂ مستور کے ناموں سے تین کتابوں کی شکل میں شائع ہوئی۔

★ معارف القرآن جلد چہارم کا عنوان "معراج انسانیت" ہے، جو پاکستان میں شائع ہوئی۔

★ معارف القرآن جلد پنجم "انسان نے کیا سوچا؟" کے عنوان سے پاکستان میں شائع ہوئی۔

★ معارف القرآن جلد ششم "اسلام کیا ہے" کے عنوان سے پاکستان میں شائع ہوئی۔

★ معارف القرآن جلد ہفتم "جہانِ فردا" کے عنوان سے پاکستان میں شائع ہوئی

★ معارف القرآن جلد ہشتم "کتاب التقدیر" کے عنوان سے پاکستان میں شائع ہوئی

معارف القرآن کی جلدوں کی مندرجہ بالا ترتیب محترم پرویز صاحب نے اپنی کتاب ابلیس و آدم کے سنہ ۱۹۷۲ء کے ایڈیشن میں بذات خود تحریر فرمائی ہے۔

تشکیل پاکستان سے فروری ۱۹۸۵ء تک طلوعِ اسلام اور محترم پرویز صاحب نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے، وہ آئندہ کسی اشاعت میں تفصیل سے آپ کے سامنے آئیں گے۔ انشاءاللہ

مرتبہ:۔ محمد اسلام (نمائندہ طلوع اسلام کراچی) (ادارہ)

خونِ دِل کے چراغ

قدم قدم پہ جلاتا ہوں خونِ دل کے چراغ   یہ سوچ کر کوئی پیچھے بھی آ رہا ہوگا - !

قدم قدم پہ خونِ دل کے چراغ جلانے والے مردِ درد آشنا مفکرِ قرآن جناب پرویز اس آرزوئے نایاب کے ساتھ سفرِ آخرت پر روانہ ہوگئے کہ ان کے پیچھے راہِ صدق وصفا اختیار کرنے والوں میں کمی نہ ہو۔ یہ حقیقت ہم سب کے سامنے ہے کہ اُس صاحبِ دل نے مسلسل پچاس برس تک خونِ دل کے جو چراغ جلائے ان کی روشنی اندھیروں کے ستائے ہوؤں کے لئے کس قدر کارگر ثابت ہوئی - یہ روشنی خالصتاً قرآن کی آواز تھی جو اس بصیرت قرآنی رکھنے والے کی زبان سے جب ایک بے مثل انداز میں سامعہ نواز ہوئی تو جیسے آناً فاناً دلوں پر چھائی تاریکیاں چھٹ گئیں - یہ تاریکیاں تھیں یا شیطانی ہیولے باطل عقائد کے - غلط تصورات کے خود ساختہ مفروضات کے، تقلیدِ اسلاف کے، جامد خیالات کے، فاسد جذبات کے - ان سب کی زنجیروں نے قلوب واذہان کو جکڑ رکھا تھا - ان پر حق کی ضرب پڑی تو یہ بظاہر مضبوط زنجیریں کچے دھاگے کی طرح ٹوٹتی چلی گئیں - خونِ دل کے چراغوں کی قرآنی روشنی کے سامنے ابلیسی اندھیروں کے ناگ کیونکر ٹھہر سکتے تھے! درسِ قرآن کی وہ شُستہ وشائستہ، سنجیدہ مگر شگفتہ نشین ہمیں کب بھول سکتی ہیں جن میں شریک ہو کر ہمیں اپنے دل و دماغ کو منوّر کرنے کی چوبیس پچیس برس تک سعادت حاصل رہی -

اپنے معلم مشفق کو یاد کرتے ہوئے دل یہ تقاضا کر رہا ہے کہ ان کی بتائی ہوئی صداقتوں اور اُن کی دکھائی ہوئی حقیقتوں کو بار بار اجاگر کیا جائے تاکہ ہمیں اپنے ذہن سے سوچنے اور عقل و فکر سے کام لینے کی تحریک ملتی رہے - ہم اپنی ذمہ داری سے غافل نہ ہو جائیں - آج جی چاہ رہا ہے کہ باباجی کے درس سنتے ہوئے جو کچھ میں ساتھ کے ساتھ قلمبند کرتی رہی ان میں سے چند باتیں پیش کروں کہ سچائیاں ہمیشہ سامنے رہنی چاہئیں - ایک سال قبل اسی مہینے مئی کی گیارہ تاریخ کو اسی مفکرِ قرآن نے درس دیتے ہوئے ایک موقع پر فرمایا "عزیزانِ من! قرآن کریم کبھی ختم نہ ہونے والا بحرِ ذخّار ہے - ازل اس کے پیچھے ابد سامنے نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے - اس کتاب کے ختم ہو جانے کا تو سوال ہی نہیں - یہ متاعِ حیات ہے یہ سرمایۂ زندگی ہے - میرے لئے اس کائنات میں مرغوب ترین متاعِ حیات کتابِ خداوندی ہے اور عزیز ترین ہستی سیّدالمرسلین رسولِ کریمؐ ہیں، اس کتاب کو لانے والے - قریب پچاس سال سے میری کیفیت یہ ہے کہ ہر روز بجز اس کے کہ میں طبعی طور پر معذور نہ ہو گیا ہوں، میں قرآن ... کی آیات سے اپنے قلب کو منوّر کرتا آ رہا ہوں" - ایک دوسرے درس میں یہ تلخ حقیقت سامنے لائے کہ " انسان کی مشکل یہ ہے

کہ ظاہری طور پر ہر انسان انسان ہی ہوتا ہے اور اسی وجہ سے ہم دھوکا کھا جاتے ہیں اور ساری مصیبتیں اسی دھوکے کے ہاتھوں ہوتی ہیں۔ دھوکا دینے والے تو ایسا میک اپ کرتے ہیں کہ دوسرے کو پتہ ہی نہیں چلتا"۔ اور اس کے بعد ہمارے باباجی نے کس شدتِ تمنا سے کہا تھا" وہ معاشرہ کیسا جنت بداماں ہوگا کہ جس میں دور سے ہی دیکھ کر انسان کو پہچان لیا جائے کہ یہ کیسا ہے؟" حق و باطل کی وضاحت کرتے ہوئے مفکرِ قرآن نے بتایا کہ " یہ قرآن کی بڑی جامع اصطلاحات ہیں اور یاد رہے کہ حق کے اندر پورے کا پورا دین آجاتا ہے اور باطل کے اندر دنیا کے تمام حق کے مخالف نظام آجاتے ہیں۔" اسی درس میں آپ نے کہا تھا کہ " بت پرستی اسی لئے دنیا کے اندر چلی ہوئی تھی کہ بُت سامنے سے کچھ کہتا نہیں اور یہ بات انسان کی خود فریبی کو بڑی راس آئی ہوئی تھی۔ ہم نے خدا کو بھی بُت بنالیا ہماری دانست میں وہ بھی سامنے سے کچھ کہتا نہیں۔" اس کے بعد پرویز صاحب نے ہمیں یاد دلایا تھا کہ " احتسابِ خویش کے بغیر انسان انسانیت کی منزل میں داخل نہیں ہوسکتا۔" مگر ہم انسانوں کی حالت یہ ہے کہ باباجی نے کہا" ہر انسان اپنا فائدہ تلاش کرتا ہے۔ ہر فرد ہر قبیلہ ہر خاندان ہر قوم اپنا فائدہ سوچتی ہے دوسرے کا نہیں۔ اسی سے سارے فساد جھگڑے برپا ہوتے ہیں جبکہ قرآن کا نظریہ یہ ہے کہ جو عمل، جو تصوّر۔ جو نظریہ۔ جو نظام نوعِ انسان کی منفعت اپنے سامنے رکھتا ہے اسی کو بقا ہے۔ سارے قرآن میں یہ نظر آئے گا کہ سارا ٹکراؤ اپنے فائدہ اور انسانیت کے فائدہ کا ہے"

عقلِ خود بیں غافل از بہبودِ غیر — سود خود بیند نہ بیند سودِ غیر

قرآن کا سارا پروگرام عقلِ خود بیں اور عقلِ جہاں بیں کے درمیان ٹکراؤ کا ہے، یہی اسلام ہے"۔ یکم جون ۱۹۸۴ء کے درس میں باباجی نے ہمیں یہ روشنی دکھائی تھی کہ "تمام خرابیوں کی جڑ یہ ہے کہ انسان سمجھے مجھے کون پوچھ سکتا ہے؟ اور حسنات کا سرچشمہ یہ ہے کہ انسان جو کچھ سوچے سمجھے، کرے، سب کے متعلق یہ ایمان ہو کہ ان کا نتیجہ نکلے گا، کوئی مجھے پوچھے یا نہ پوچھے۔" قرآن کو سمجھنے کے لئے مفکرِ قرآن نے اس بنیادی نکتہ کی طرف توجہ دلائی کہ " خود ساختہ تصوّرات کو ذہن سے الگ کئے بغیر قرآن سمجھ میں نہیں آئے گا۔ اگر آپ خود ساختہ خیالات کے ساتھ قرآن کی طرف آتے ہیں تو آپ قرآن سمجھتے ہوئے اُسے اپنے خیالات کے تابع رکھنا چاہتے ہیں۔ پہلے خالی الذہن ہونا پڑے گا، پھر قرآن کی طرف آنا ہوگا۔ جب آپ کسی فرقے سے متعلق ہوجائیں گے تو قیامت تک قرآن آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔ فرقے کے معتقدات پلے بندھے ہوں تو قرآن کس طرح سمجھ میں آئے!" ایک درس میں اسی مردِ مومن نے مومن کا تعارف یوں کروایا تھا" مومن کی زندگی حرارت اور برودت کے معتدلانہ امتزاج کا نام ہے"

ایک موقع پر آپ نے غلط نظامِ زندگی قائم کرنے والوں کے متعلق یہ حقیقت کشائی کی تھی کہ " جو یہاں غلط نظامِ زندگی قائم کرتے ہیں، کیا وہ آزاد پھر رہے ہوتے ہیں؟ کیا ان کے

آئے طوق وسلاسل نہیں ہوتے! محکومیت وغلامی کی زندگی، محتاجی کی زندگی کیا یہ آگ کے شعلے نہیں انسانوں کی محکومیت میں کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ طوق وسلاسل میں گرفتار نہیں؟ انسان کے خود پیدا کردہ یہ طوق وسلاسل جس میں ایسا جکڑا ہوا ہے کہ انہیں کبھی توڑ نہیں سکتا۔" دوسرے موقع پر باباجی نے ہمارا یہ المیہ بھی تو بتایا تھا کہ "قرآن کا تو یہ فرمان ہے کہ قرآن زندگی دینے کے لیے بھیجا گیا ہے مگر ہم نے اسے موت لانے کے لئے رکھ دیا ہے کہ ؎ از یٰسین او آساں بمیری۔" انہوں نے کفر کی زندگی کی تشریح اس اک جملے میں کی تھی کہ "کفر کی زندگی باطل کے نظام یعنی غیر خداوندی نظام کے ماتحت زندگی بسر کرنا ہے۔"

بچے کی تربیت کے بارے میں رہنمائی سے بھی والدین کو تشنہ نہیں رکھا ایک دفعہ درس کے دوران باباجی نے فرمایا۔ "بچے کو بچپن سے ہی ایسی تعلیم دو کہ جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے بُرا کہا ہے وہ اسے بُرا سمجھے اور جس کو اچھا بتایا ہے اسے اچھا سمجھے اسی سے وہ تربیت یافتہ ضمیر بنتا ہے کہ باشعور ہو کر ایسے لوگوں کو گھومتا گھامتا خیال بھی بُرا آجاتا ہے تو وہ فوراً قانون خداوندی میں پناہ ڈھونڈتے ہیں۔" اس معلم مشفق نے تحریر میں تقریر میں سینکڑوں ہزاروں دفعہ ہماری رہنمائی کی اور اس دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد بھی ہمیں محروم نہیں چھوڑ گئے۔ ان کی بے بہا تصانیف ہمارے لئے روشنی کا مینار ہیں۔ میں نے باباجی کے درسوں کو سامنے رکھ کر دلوں کے لئے تقویت وطمانیت بہم پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ ذرا یاد کیجئے ۱۵ اکتوبر ۱۹۸۴ء کے درس کو۔ اس وقت ہم میں سے کون جانتا تھا کہ آج کے بعد ہم اس عزیز ہستی کو اس طرح اپنے سامنے ان کی مخصوص نشست پر زندہ وجود کے ساتھ بیٹھے درس دیتے ہوئے کبھی نہ دیکھ سکیں گے۔ یہ اس مفکرِ قرآن کا آخری درس تھا۔ اس کا روشن کردہ آخری چراغ۔ مگر شروع سے آخیر تک یہ سارے چراغِ حق اسی حق آشنا نے یہی سوچ کر تو جلائے تھے کہ طالبانِ حق کو باطل کے اندھیروں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے کہ ہم باباجی کی طاہرہ بیٹیاں اور سلیم بیٹے ان چراغوں کی حفاظت کریں۔ اس کے بغیر ہم اندھیروں سے کیونکر محفوظ رہ سکیں گے۔ شاید آپ بھولے نہ ہوں کہ باباجی نے اپنے آخری درس میں دیگر حقائق قرآنی سمجھاتے ہوئے ایک یہ اہم نکتہ بھی ہمارے گوش گزار کیا تھا کہ "جب آپ سورج نکلنے کے باوجود اپنی آنکھیں بند رکھیں گے یا بند کر لیں گے تو آپ کے سامنے تاریکی چھائی رہے گی۔ آپ کی راہیں روشن نہیں ہو سکیں گی۔" سوچئے تو! یہ ایک بظاہر سادہ سی بات کیا کیا کچھ ہمیں نہیں سمجھا رہی! اور یہ بات تو ساری سوچنے کی ہے۔ ہم آپ جانتے ہیں کہ تَتَفَكَّرُوْ کے حکم خداوندی کو ہمارے ذہن نشین کرانے کے لئے باباجی کس کس پہلو سے اس پر روشنی نہیں ڈالتے رہے اور کس کس طرح اس کی اہمیت کو واضح نہیں کیا؟ اس کے باوجود اگر ہم سوچنے کا عمل اختیار نہ کریں [illegible]

میں آنا نہ چاہیں۔ اپنی آنکھیں بند رکھیں، تو آپ ہی بتائیے کہ ہمارا کوئی قدم بھی راست اٹھ سکے گا؟

جب باباجی حیات تھے تو ان کی مسلسل غور و فکر اور شبانہ روز محنت و ریاضت کی بدولت ہمیں ہر جمعے کو باباجی کی زبانی تعلیمات قرآنی حاصل ہوتی تھیں۔ ہم بڑے خوش رہتے کہ اس سلسلے میں خود کچھ نہیں کرنا پڑتا بجز اس کے کہ صبح مقررہ وقت پر ۲۵ بی گلبرگ پہنچ جائیں۔ درس بڑے شوق سے سنیں اور پھر گھروں کو لوٹ جائیں۔ گویا ہم نے صرف درس سننے کو اپنی ذمہ داری سمجھ رکھا تھا اس کے بعد پورا ہفتہ چھٹی ہو جاتی۔ درس میں سمجھے ہوئے نکات و حقائق کو ہم طاقِ نسیاں پر رکھ دیتے۔ ان پر بار بار غور و فکر کرنا۔ کشادہ نگہی سے سوچنا۔ انہیں اپنے اعمال کا حصّہ بنانا۔ دوسروں کو قرآن کا پیغام پہنچانا۔ قرآن کی طرف آنے کی ترغیب دینا۔ ان سب کی طرف ہمارا دھیان بہت کم جاتا۔ گویا ہماری ذمہ داری صرف یہ تھی کہ ہم درس سنتے رہیں۔ جبکہ ہمارے معلّم نفس شناس نے درس دینے کے دوران ہمیں بارہا متنبہ کیا کہ "یاد رکھیئے! جو کچھ میں قرآن حکیم سے سمجھ کر آپ کو بتا رہا ہوں اسے ذہنی تفریح نہ بنائیں کہ چلو کچھ دیر اچھی اچھی باتیں سننے کو مل گئیں اور بس۔ درس کی باتوں کو ساتھ ساتھ لکھتے جائیں۔ قرآن کریم کی آیات کے حوالوں کو نوٹ کریں، پھر گھر میں بیٹھ کر یکسوئی اور پوری توجہ سے ان پر غور و فکر کریں۔ سوچ سمجھ سے کام لیں۔ اس عمل کو جاری رکھنے سے آپ دیکھیں گے کہ قرآن آپ کے لئے بہت آسان ہو جائے گا۔"

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ

خونِ دل کے جو چراغ باباجی روشن کر گئے ہیں ان کو روشن رکھنا اور رکھے چلے جانا ہماری آپ کی اوّل و آخر ذمہ داری ہے۔ ہم نے بھی آگے جانا ہے اور ہمارا نصب العین یہ ہونا چاہیئے کہ یہ قرآنی چراغ اس طرح روشن رکھے جائیں کہ ہمارے بعد آگے بڑھنے والوں کے راستے اندھیرے نہ رہیں۔ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ

راقمہ

ثریا عندلیب ۴ مئی ۱۹۸۵ء

خریدار صاحبان متوجہ ہوں

خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں۔

(۱) بسا اوقات ادارہ ہذا کے نام جو منی آرڈر موصول ہوتے ہیں ان کے کوپنز (COUPONS) پر خریدار کا مکمل پتہ نہیں لکھا ہوا ہوتا۔ اس کا خاص خیال رکھا جائے۔ تاکہ تعمیل میں بلاوجہ تاخیر نہ ہو۔

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام